جولائی 2007

قیمت : -/10 روپے

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ قانونی، اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

۶اور 7 جون کو ریاستی اردو اکادمیوں کی چھٹی کانفرنس، قومی اردو کونسل اور کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام بنگلور میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح گورنر کرناٹک اب ٹی۔ این۔ چترویدی نے کیا۔ تصویر میں گورنر صاحب حاضرین سے مخاطب ہیں۔ کرسیوں پر ہیں (دائیں سے) جناب شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر علی جاوید اور اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی کے چیئرمین جناب کشمیری لال ذاکر۔

ڈائرکٹر قومی اردو کونسل ڈاکٹر علی جاوید، استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے۔ کرسیوں پر محترم بی۔ این۔ چترویدی صاحب، محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور محترم اقبال انصاری صاحب ریاستی وزیر برائے صحت و تعلیمی امور۔

بی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کلیدی خطبہ ارشاد فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد سے اردو محض مسلمانوں کی زبان کہا جانے لگا ہے، اس غلط فہمی کو دور کیا جانا ضروری ہے۔

ماہ نامہ
اردو دنیا نئی دہلی
جلد۔9، شمارہ۔7 جولائی 2007

مدیر: ڈاکٹر علی جاوید
اعزازی مدیر: مخمور سعیدی
معاون مدیر: ڈاکٹر رئیس احمد

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
کمپوزنگ: شہناز اختر
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938، 26103381
فیکس: 26108159، 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: ncpuleditorial@yahoo.co.in
urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416، 26109746

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 5

زبان اور تعلیم
● اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف .... شمس الرحمٰن فاروقی 6
● پرائمری سطح پر اردو کا نثری نصاب .... ایم آئی ساجد 9
● اردو ذریعۂ تعلیم — مسائل اور حل .... قدسیہ اختر 11
● عربی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی اداروں کی ضرورت .... ایم نسیم اعظمی 13
● زبان ایک بہتی ندی .... سندھیا سنگھ 15

ادب
● "بے در و دیوار" سید احمد شمیم کا تازہ کلام .... شمس الرحمٰن فاروقی 17
● مشاہدات زنداں (مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی) .... انور محمود خالد 19
● آئی۔ایچ۔ٹی۔ایس۔ فارکینسر .... احتشام ریشی 21

تاریخ و ثقافت
● اردو زبان اور 1857 کی بغاوت .... اقتدار عالم خاں 24
● جنوں کی حکایات خوں چکاں .... فضل الرزاق خاں ارشد 26
● عرب کے بدوی اور ہندوستان کے دیہی سماج کی مماثلت .... ابن کنول 30

صحافت
● قومی یکجہتی اور اردو ذرائع ابلاغ .... افتخار الزماں 34

شخصیت
● مولانا ابوالکلام آزاد .... وہاب قیصر 37

روبرو
● ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک مکالمہ .... اسد فیض 40

کیریئر
● روزگار کے مسائل اور اردو کا مستقبل .... رابعہ سرفراز 43
● رنگ سازی .... عبدالعلیم قدوائی 45

انٹرنیٹ
● انٹرنیٹ کے نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر .... انور ادیب 46

ہماری مطبوعات سے
● پرواز کے بعد .... قرۃ العین حیدر 48
اردو خبرنامہ .... ادارہ 55
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 68

بچوں کا گوشہ
● کمپیوٹر ماموں .... نورالرحمٰن فاروقی 74

آپ کی بات

■ ش. صغیر ادیب، 65 بلیک برن اسٹریٹ، بلیک برن، لینکس، بی. بی. آئی.، ٹی. این. جی.، یو. کے.

''فکر و تحقیق'' کا داغ نمبر ملا تھا اور یقین کیجیے میں بہت خوش ہوا تھا۔ یہ بہت وقیع اور جامع نمبر تھا۔ سارے مضامین نہایت اعلیٰ ہیں اور داغ کی حیات و فن کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اتنا قیمتی اور محفوظ رکھنے کے قابل نمبر شائع کرنے پر میں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

■ ناوک حمزہ پوری، دارلادب، حمزہ پور، شیر گھاٹی، گیا (بہار)

سوال نمبر ا کے جواب میں حضرت فاروقی نے بجا فرمایا ہے کہ وارنا اردو کا ایک مصدر بھی ہے لیکن اس کے معنی کے سلسلے میں نچھاور کرنا، قربان کرنا غالباً سہواً چھوٹ گیا ہے۔

یہ درست ہے کہ جریدہ بمعنی تنہا اب کم استعمال میں ہے لیکن اب بھی جہاں تک رسالے اور جریدے کا تعلق ہے یہ لفظ اپنے اسی مخصوص معنی میں مستعمل ہے۔ ''رسالہ'' یہ ضمانت دیتا ہے کہ اس کے بعد بھی مقررہ میعاد پر اگلا شمارہ آئے گا۔ جریدہ یہ ضمانت نہیں دیتا۔ یعنی یہ جتا دیتا ہے کہ مجھی کو پڑھ کے صبر و شکر کرلو۔ آئندہ انتظار میں مت رہو۔

ہمزہ بعض الفاظ کے درمیان میں آنے والی متصل دو یے میں سے ایک کی جگہ بطور بدل بھی آتا ہے مثلاً تعیین = تعئن ۔ وغیرہ محترمہ سالکہ خاتون صدیقی نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ بیالیس سال تک ننھے منوں، بھولے بھالے بچوں کو اردو پڑھانے کا تجربہ اس خاکسار کو بھی ہے۔ چاے اور گاے (جانور) لاریب و شک تین حرفی ہیں۔ ے پر ہمزہ بڑھا کر اسے چار حرفی لکھنا، کہنا، سمجھنا سب غلط ہے۔ (ہجے کیجیے یا کرائیے = گاف الف زبر گا یے موقوف۔) اسی طرح گوشت، دوست، پوست وغیرہ کے ہجے کیجیے یا کرائیے: گاف واو پیش گوش ساکن ت موقوف۔ وغیرہ 42 برس میں مجھے کہیں دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔

■ پروفیسر ایس. اخلاق حسین اثر، صادق منزل، چوکی امام باڑہ، بھوپال-462001

کونسل کے ڈائرکٹر کے عہدے پر آپ کے تقرر سے خوشی ہوئی۔ خدا مبارک کرے۔ آپ کے پروقار لباس میں سب کے ساتھ انصاف کے لیے پیغام بھی ہے۔

سالکہ خاتون صدیقی صاحبہ کا مراسلہ نما مضمون ''املا اور تلفظ کے کچھ مسائل'' اور ان پر محترم فاروقی صاحب کا تبصرہ، دونوں حاصل مطالعہ ہیں۔ ایک بار پروفیسر ابو محمد سحر مرحوم نے فرمایا تھا کہ اساتذہ کے انتقال کے بعد شاگردوں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔ پھر یہ دریافت فرمایا تھا کہ دوسرے ساکن حرف کے لیے کون سی علامت استعمال کی جاتی ہے اور اس کا کیا نام ہے۔ اردو لسانیات اور املا پر میری نظر محدود ہے اور جو کچھ اعتماد تھا اس کو بھی اردو کے بعض ماہرین لسانیات نے متزلزل کر دیا ہے۔ میں خاموش رہا۔ ظاہر ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا۔ محترم فاروقی صاحب نے فرمایا ہے کہ ''دوست میں آخری تینوں حروف ساکن ہیں اور س ت کو موقوف کہا جائے گا'' جناب فاروقی صاحب سے یہ دریافت کرنا ہے کہ تین ساکن حروف کے لیے کیا کوئی الگ الگ نام یا علامتیں ہیں؟ لفظ دوست پہلی یا دوسری کتاب میں شامل ہوتا ہے۔ دوست کا مفہوم سمجھانا آسان ہے جبکہ اس کے ہجے کرنا مشکل ہے۔ اس سطح پر ''دوست میں آخری تینوں حرف ساکن ہیں اور س ت کو موقوف کہا جائے گا'' کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ علم ہجا پر مجھے نہ تو کتاب ملی اور نہ ہی کسی کتاب کا سراغ ملا پہلے اردو کی درسی کتب کی مشق میں ''یاد کر لیجے'' بھی ہوتی تھی۔ فیروز اللغات کے بیسویں ایڈیشن (1976) ص 506 پر دوست کا درج ذیل تلفظ درج ہے:

دوست (دو۔ ست)

''اردو دنیا'' کا اپریل کا شمارہ دوسری تیسری تاریخ کو مل گیا تھا۔ اسی وقت میں نے چندر بھان خیال کا مضمون ''کتنے پاکستان'' پڑھا اور علامہ شبلی کے تحقیر آمیز ذکر پر تعجب ہوا۔ تازہ شمارے میں ''اعتذار'' کی اشاعت پر مجھے اعتراض ہے۔

1. اعتذار پر میرا اعتراض یہ ہے کہ میرا مراسلہ شائع کر کے جناب چندر بھان خیال اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اظہار خیال کا موقع دیا جاتا۔

2. کملیشور نے ناول میں ایک جگہ نہیں دو جگہ شبلی کا تحقیر آمیز ذکر کیا ہے۔

3. اگر کملیشور کے ریمارک سے اتفاق نہیں تھا، تو اشاعت کے وقت اس کا

اظہار کیوں نہیں کیا گیا۔

4. مردہ کملیشور کا نقطۂ نظر اہم ہے زندہ قلمکار کی کوئی حیثیت نہیں؟

5. ''عام طور پر قارئین نے اس مضمون کو پسند کیا۔'' تین مراسلہ نگاروں نے پسند کیا، نو مراسلہ نگاروں نے نظر انداز کیا۔

6. ''جن حضرات کو تکلیف پہنچی ہے۔'' ان کے نام کیوں نہیں دیے گئے۔

1. نام دینا غیر ضروری تھا۔ ادارے کے اعتذار کے بعد اب یہ بحث بھی غیر ضروری ہے، اس لیے اسے یہیں ختم کیا جاتا ہے۔ ادارہ

■ **زاہد محمود انور، حور بانو منزل، اولڈ ایچ. بی. روڈ، شانتی نگر، رانچی-1**

''اردو دنیا'' مئی کا شمارہ وقت پر بک اسٹال پر دستیاب ہوگیا۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کیا حسین اور لاجواب سرورق ہے۔ یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر علی جاوید صاحب نے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید علمی و ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کی سربراہی میں اردو کونسل ترقی کی نئی منزلیں طے کرے گی۔ ''اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف'' از شمس الرحمٰن فاروقی بہت ہی مفید سلسلہ ہے۔ اسے برابر جاری رکھیے۔ ''اردو کا شاہکار ناول— کئی چاند تھے سرآسماں'' از احمد محفوظ، ''یونان کا کلاسیکی ڈراما'' از غلام نبی خیال، عمدہ مضامین ہیں۔ گجراتی کہانی ''نابینا'' از عابد سورتی بہت ہی موثر ہے۔ بچوں کا گوشہ بھی خوب ہے حضرت امیر خسرو کی چند پہیلیاں بھی عمدہ ہیں اور میں نے پہلی بار ان پہیلیوں کو پڑھا ہے۔ پہیلیوں سرور الہدیٰ کی کتاب پر مخمور سعیدی کا بہترین تبصرہ بھی شامل شمارہ ہے۔ ''اردو دنیا'' اعلیٰ منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

■ **محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج کالج، نظام آباد، آندھرا پردیش**

''اردو دنیا'' کا مئی 2007 کا شمارہ یکم مئی 2007 کو ہمدست ہوا بروقت ملنے سے آسودگی حاصل ہوئی۔ اس رسالے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا مواد قاری کو عصری دنیا میں لے جاتا ہے۔ اردو کے لیے ایسا ہی رسالہ ضروری ہے۔ اس کے مشمولات مختلف علوم و فنون پر مبنی ہوتے ہیں۔ عالم گیریت و آفاقیت کے اس دور میں اردو والوں کو عصری حالات سے واقفیت کے لیے ''اردو دنیا'' پڑھنا ضروری ہے۔ تاج سوسائٹی کے اس زمانے میں ''اردو دنیا'' ایسا مواد فراہم کر رہا ہے کہ جس سے فیض اٹھا کر اردو والے متنوع علوم و فنون حاصل کر سکتے ہیں تعلیم تجارت، ادب اور دیگر موضوعات پر مشتمل مضامین عصری اہمیت لیے ہوتے ہیں سید فضل اللہ مکرم کا مضمون میں نے بہت توجہ سے پڑھا عموماً ہم درخواست یوں ہی لکھ دیتے ہیں لیکن درخواست لکھنا واقعی ایک فن ہے۔

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (جون 2007) موصول ہوا۔ اس کے کچھ مشمولات اور ان کی ترتیب بہت سلیقے سے کی گئی ہے۔ زبان، تعلیم اور ادب کے تحت اردو تعلیم کے تعلیمی مسائل اور درسی موقف کو پیش کیا گیا۔ ریاست جموں، کشمیر میں اردو تعلیم بھی بہت خوب ہے ہر ریاست میں اردو کے موقف پر اس طرح کے مضامین شائع ہوں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پورے ملک میں اردو کا عمومی موقف و تناسب کتنا ہے اگر کم ہے تو اس کی وسعت اور چلن کے لیے پلاننگ اور کتابی منصوبے بنانے ہوں گے۔ اردو کے سرکاری موقف اور دوسری سرکاری زبان بنانے کے لیے ہر ریاست کی اردو تنظیمیں حکومت کے ایوان میں اپنی عرض داخل کریں۔ اردو مشاعروں کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت بہت خوب ہے مجاہدین آزادی کے تحت کئی مشاہیر پر مضامین شامل اشاعت ہیں جن میں 1857 کی جنگ آزادی کے ہیرو اور سورماؤں کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد محمود فیض آبادی نے ماحولیاتی تحفظ کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے، ماحولیات کے عدم توازن سے ہی موسم شدید تر ہوتے جا رہے ہیں۔ فطرت میں مداخلت سے انسانی زندگی عدم توازن کا شکار ہو جائے گی۔ باقی ذیلی عنوانات کے تحت جو مضامین و نگارشات شائع ہوئے ہیں وہ بھی فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں اردو دنیا 21ویں صدی کی عصری ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے اگر اردو قاری و طالب علم اس سے استفادہ کریں تو وہ عصری ماحول میں اپنا مقام بنا سکیں گے۔ خاص کر مسابقتی دنیا میں کامیابی و کامرانی کے لیے اردو دنیا سے استفادہ لازمی ہے۔

■ **ڈاکٹر سید احمد قادری، نیو کریم گنج، گیا-823001**

''اردو دنیا'' کا شمارہ مئی 2007 اہم اور معیاری مشمولات سے پُر ہے۔ ''ہماری بات'' کے تحت اداریہ جاندار ہے۔ 1857 کے غدر میں یوں تو ہزاروں، لاکھوں لوگوں نے ملک کی آزادی کے لیے کوششیں کیں اور قربانیاں دیں جن کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف میں موجود ہیں، لیکن ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے تذکرے کم ہی پڑھنے کو ملتے ہیں، جنھوں نے اپنے قلم کو شمشیر برہنہ کی طرح استعمال کیا اور انگریزوں کے عتاب کے شکار ہوئے۔ ایسے محب الوطن جاں نثاروں پر اگر سیمینار کیے جائیں، خصوصی نمبر شائع

کیے جائیں، تو میرے خیال میں، برسہابرس سے فراموش کیے جانے کا جو درد ہے، اس کا کسی حد تک مداوا ہوسکتا ہے یوں بھی دیکھا جاتا ہے کہ فی زمانہ ادب پر سیاست بھاری ہے۔ اسے توڑنے کی ضرورت ہے۔

دیگر مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں، خاص طور پر ابوالکلام کا مضمون ''افسانوی ادب کا ترجمہ'' بہت اچھا مضمون ہے۔ تخلیقی فن پارے کا ترجمہ آسان نہیں، جب تک مترجم اس فن اور فنکار کی روح کی گہرائیوں تک نہ اترے۔

ڈاکٹر علی جاوید کے اجمالی تعارف کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر علی جاوید کافی متحرک اور فعال رہے ہیں، اس لیے ان سے پوری اردو دنیا کو توقع ہے کہ اردو کونسل کو مزید فعال اور متحرک بنانے میں اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لائیں گے۔ میری جانب سے مبارک باد۔

■ **رضوان خان، سیکریٹری بزم اردو، 96 شیخ سرائے، سیتاپور**

''اردو دنیا'' بابت جون 2007 موصول ہوا۔ 1857 کی پہلی جنگِ آزادی کے حوالے سے مضامین شائع کرکے آپ نے قابل تعریف کام کیا ہے۔ سید داؤد اشرف صاحب کا مضمون ''مولوی علاء الدین'' اور جناب لئیق رضوی کا مضمون ''مولوی لیاقت علی'' بہت پسند آئے۔ جنگ آزادی میں ہمارے علمائے دین کی کارکردگی اور قربانی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہمارے ضلع سیتاپور کے تاریخی قصبے خیرآباد کے مشہور عالم دین مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے جابر انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کا فتویٰ جاری کرکے تمام مسلمانوں کو وطن عزیز کے لیے مجاہدہ کرنے کا پیغام دیا تھا۔ انھیں کالا پانی کی سزا ہوئی اور انڈمان نکوبار میں ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

اس شمارے کے دیگر مضامین میں ''طرہ باز خاں'' اور ''اتر پردیش میں اردو بحیثیت دوسری سرکاری زبان'' بھی بہت اچھے ہیں۔

■ **مدثر لطیفی تاثیر، معرفت اے۔ایل۔بلوان، طلیل لاج، محلہ آستان، ڈوڈہ سٹی-182202 (جموں کشمیر)**

تقریباً دو تین سال سے ''اردو دنیا'' کی تحریروں سے مستفید ہورہا ہوں لیکن قلم کو جنبش دینے کی ہمت نہ جٹا سکا لیکن جون 2007 کے شمارے میں محترم الطاف انجم صاحب کے مضمون ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو'' نے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ چند باتوں کو چھوڑ کر مجھے ان کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں ہے۔ کیوں کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو کا جو حال ہے اس سے ابتر حال ہندوستان میں اردو زبان کا کہیں بھی نہیں ہے جو خوبصورت تصویر الطاف صاحب نے دکھائی ہے وہ کسی حد تک صحیح ہے مگر صرف کشمیر تک۔ جموں میں ڈوڈہ، پونچھ اور راجوری کے چند علاقوں کے علاوہ اردو کا جنازہ کب کا نکل چکا ہے۔ موصوف شاید وادی سے باہر کم نکلتے ہیں اور اگر نکلتے بھی ہوں گے تو بذریعۂ ہوائی جہاز ورنہ وہ زمینی حقائق سے اس قدر بے خبر نہ ہوتے۔ نیشنل ہائی وے پر انھوں نے شاید کبھی سفر نہ کیا اگر اردو کی زبوں حالی دیکھنی ہو تو اس 300 کلومیٹر سے زائد لمبی سڑک پر کسی بھی جگہ سنگ میل پر اردو، اردو جیسی نہیں دکھتی۔ لکھنے والا ہی جانتا ہے کہ اس نے اردو کی خاطر کس رسم الخط کو استعمال کیا ہے۔

جہاں تک سرکاری زبان ہونے کا تعلق ہے تو چند محکموں کے علاوہ کسی بھی جگہ اردو کا استعمال نہیں ہوتا۔ کسی بھی سرکاری دفتر کا بورڈ اردو میں لکھا نہیں ہوتا ہے حال ہی میں خورشید احمد صاحب کمنائی نے جو کہ G.A.D. کے سرپرست ہیں ایک حکم نامہ تمام اداروں کو بھیجا تھا کہ تمام سرکاری عمارتوں کے بورڈ اردو میں ہونے چاہئیں مگر صوبہ جموں کے ضلع ترقیاتی کمشنروں کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی۔ کشمیر میں حالت پھر بھی قدرے بہتر ہے۔

اردو زبان کو ابتدائی جماعت سے دسویں جماعت تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا تھا۔ میں اپنے ادارے میں داخلہ اور امتحانات کا انچارج بھی ہوں مجھے علم نہیں کہ کس آرڈر کے تحت الطاف صاحب اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو لازمی سبجیکٹ ہے حالانکہ حقیقتاً J&K Board of School Education کی واضح ہدایات ہیں کہ اردو یا ہندی میں سے ایک مضمون چننا لازمی ہے اور اکثر ہندی کا ہی انتخاب کرتے ہیں اور جہاں اردو کا انتخاب ہوتا ہے وہاں بھی مجبوری میں۔ کشمیر کے چند بہت اچھے اسکولوں کے بچوں کی بات کی جائے تو Burn Hall BISCO وغیرہ کے جن بچوں سے ملا وہ ہندی میں اچھے تھے اور اردو سے متنفر۔

باقی کشمیر کو جموں وکشمیر سمجھنا ان کی سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔ ایک کروڑ سے زائد آبادی والی ریاست کی یونیورسٹی میں اردو کے لیے 65 نشستیں مختص ہوں تو آپ اردو پر دی جانے والی توجہ کو خود محسوس کرسکتے ہیں۔

امید ہے کہ حقیقت کو سامنے رکھ کر کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ اس گنگا جمنی تہذیب کی آخری نشانی کو زندہ رکھا جائے۔

□□□

ہماری بات

اخباری اطلاعات کے مطابق پچھلے دنوں دلی حکومت کے وزیر تعلیم سے اردو اساتذہ کے ایک وفد نے ملاقات کی اور دلی کے اردو میڈیم اسکولوں کے غیر تسلی بخش حالات سے انھیں باخبر کرایا۔ جو شکایات انھوں نے وزیر محترم تک پہنچائیں، ان میں دو بہ طور خاص توجہ طلب تھیں۔ اردو میڈیم کی درسی کتابوں کا بروقت مہیا نہ کرایا جانا اور متعدد مضامین کے اردو اساتذہ کا اسکولوں میں موجود نہ ہونا۔ وزیر موصوف نے ان کی باتیں توجہ سے سنیں اور اپنی طرف سے ضروری ہدایات جاری کرنے کی یقین دہانی بھی کرائی۔

یہ دونوں مسئلے بہت پرانے ہیں جو ہر تعلیمی سال کے آغاز پر تازہ ہوجاتے ہیں مگر اب تک حل نہیں ہوسکے۔ ان مسئلوں کے حل کی راہ میں حائل کچھ دشواریاں حقیقی ہیں، مثلاً مروجہ نصاب میں بار بار تبدیلیاں جن کی وجہ سے ہر بار نئی کتابیں بنانا اور چھاپنا پڑ جاتی ہیں۔ اس کام کو سرانجام دینا ریاستی سطح پر ایس سی ای آر ٹی اور مرکزی سطح پر این سی ای آر ٹی کی ذمے داری ہے۔ یہ دونوں ادارے انگریزی کتابیں بروقت چھاپ دیتے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ کتابیں انگریزی ہی میں تیار کی جاتی ہیں اور ترجمے کے مرحلے سے گزرے بغیر سیدھی پریس چلی جاتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انگریزی کو دیسی زبانوں پر ترجیح دی جاتی ہے کہ یہ مقتدر زبان ہے۔ ہندی میں بھی کتابیں آنے میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں ہوتی حالانکہ انھیں ترجمے کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سوال غور طلب ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اردو کی نصابی کتابیں بعض صورتوں میں پورا تعلیمی سال گزر جانے پر بھی دستیاب نہیں ہو پاتیں اور ان کی اشاعت تو ہمیشہ تاخیر سے عمل میں آتی ہی ہے۔ خدا جانے اس کی وجہ متعلقہ اداروں میں اردو عملے کی کمی ہے یا اس کی اپنے فرائض کے تئیں کوتاہی اور غفلت۔ موخرالذکر صورت قابلِ افسوس ہی نہیں، درخورِ ماتم بھی ہے لیکن اول الذکر صورت میں متعلقہ محکموں کا فرض ہے کہ وہ حسب ضرورت اسٹاف بھرتی کریں۔

جہاں تک اردو میڈیم اسکولوں میں مختلف مضامین کے اساتذہ کی کمی کا مسئلہ ہے، یہ بھی فوری توجہ چاہتا ہے۔ دلی میں جب اردو کو پنجابی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان ہوا تھا تو اردو والوں کے دلوں میں یہ امید جاگی تھی کہ حکومت اب اس مسئلے کی طرف بھی متوجہ ہوگی اور اردو کے نئے اساتذہ کا تقرر عمل میں آئے گا۔ لیکن یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ حکومت چاہتی تو اردو اساتذہ کی خالی جگہوں پر انھی اساتذہ کا تقرر کرسکتی تھی جو برسوں سے دہلی اردو اکادمی کی طرف سے معمولی مشاہرے پر اردو اسکولوں میں جزوقتی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان اساتذہ کے نمائندوں نے اس سلسلے میں حکومت سے رجوع بھی کیا، خود وزیر اعلیٰ نے ان کے مطالبے پر غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن یہ وعدہ محض وعدہ ہی رہا، اس کے پورا ہونے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔ بالفرض اس راہ میں کچھ قانونی رکاوٹیں ہیں یا کسی طرف سے مخالفت کا اندیشہ ہے تو کیا ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور ان اندیشوں کو رفع کرنے کی کوئی صورت نہیں نکالی جاسکتی؟ ہم حکومت کی نیت پر شک تو نہیں کرتے لیکن اس کا طرزِ عمل دیکھ کر ہمیں ایک شعر بار بار یاد آتا ہے:

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعنِ اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

دلی اردو اکادمی کی طرح دلی کی پنجابی اکادمی نے بھی ان سرکاری اسکولوں میں جزوقتی پنجابی اساتذہ کا تقرر کر رکھا تھا جہاں پنجابی پڑھائی جاتی ہے۔ اردو اکادمی نے جتنے اساتذہ کو جزوقتی عارضی نوکریاں دیں، وہ سب تربیت یافتہ تھے جبکہ پنجابی اکادمی نے پنجابی زبان میں ٹرینڈ ٹیچروں کی کمی کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی نوکریاں دے دی تھیں جو اس کی نظر میں پنجابی پڑھانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ سنا گیا ہے کہ اردو کی طرح پنجابی کے دوسری سرکاری زبان بن جانے کے بعد پنجابی اکادمی کے بہت سے ٹیچروں کو سرکاری اسکولوں میں بحال کردیا گیا ہے، اگر یہ خبر صحیح ہے تو اسی طرح اردو اکادمی کے عارضی اساتذہ کو مستقل ملازمت کیوں نہیں دی جاسکتی؟ ایک ہی محکمہ دو زبانوں کے بارے میں الگ الگ طرزِ عمل اختیار کرے، بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

دلی میں اردو کے خیرخواہوں کی کمی نہیں، اگر وہ متحد ہوکر اردو کے حق میں آواز اٹھائیں اور اس عوامی زبان کے حقوق کی بازیابی کے لیے متفقہ طور پر جدوجہد کریں تو کچھ مثبت نتائج ضرور سامنے آئیں گے۔ کبھی کبھار اپنے حقوق کی یاددہانی کرادینا یا اپنی زبان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر زبان پر لے آنا، کافی نہیں۔ وسائل کی کمی کا عذر کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ یہاں ضرورت وسائل کی نہیں، خلوصِ نیت اور اپنی دوسری مصروفیتوں میں سے تھوڑا سا وقت اس اہم فریضے کی ادائیگی کے لیے نکالنے کا ہے۔

□□□

شمس الرحمٰن فاروقی

اچھی اردو: روزمرہ، محاورہ، صرف

اس کالم میں اردو روزمرہ اور اردو زبان کے بارے میں قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ سوالات نہ پوچھے جائیں اور سوالات کا تعلق الفاظ کے استعمال، روزمرہ میں ان کے صرف اور ان کے معنی کے بارے میں ہو۔

ادارہ

سوال: اردو میں محاورے کس طرح تشکیل پاتے ہیں؟ محاورے کا استعمال تخلیقی ہوتا ہے یا تقلیدی؟ زبان میں محاورے ایک دم استعمال میں آتے ہیں یا یہ چراغ سے چراغ جلانے کا عمل ہے؟

جواب: صرف اردو ہی نہیں، ہر زبان میں محاورے دراصل پرانے استعارے ہیں جو اس قدر مقبول ہوئے کہ عام زبان میں داخل ہو گئے، پھر انھیں محاورہ کہا گیا۔ ''محاورہ'' کے معنی ہی ہیں '' آپس میں بات کرنا، آپس میں سوال جواب کرنا''۔ استعارہ زبان کا جوہر ہے اور بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تمام زبان استعاراتی ہے۔ بہر حال، استعارہ سازی کا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ استعارہ بنانا تخلیقی کام ہے۔

سوال: لفظ میں معنی پہلے ہوتے ہیں یا لکھنے والا معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ بناتا ہے؟

جواب: کسی لفظ میں کوئی معنی پہلے سے نہیں ہوتے۔ لفظ میں معنی، بولنے والوں کے مختارات اور استعمال عام اور سیاق و سباق کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں۔

سوال: نئے لفظ کس طرح بنتے ہیں اور ہر دن اردو میں کتنے لفظوں کا اضافہ ہوتا ہے؟

جواب: آپ کے سوال کے پہلے حصے کا جواب اوپر عرض کر چکا ہوں۔ فی الوقت کوئی ایسے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کی روشنی میں ہم کہہ سکیں کہ اردو میں کتنے لفظ ہر روز، یا ہر مہینے، یا ہر سال داخل ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کوئی لفظ کچھ لوگوں یا کسی خاص طبقۂ آبادی (مثلاً طالب علم، گھر کی عورتیں، سائنس داں، اخبار نویس وغیرہ) میں تھوڑا بہت جاری ہوتا ہے۔ پھر کبھی کبھی اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد کم یا ختم ہو جاتی ہے یا بڑھ جاتی ہے۔ موخر الذکر صورت میں اگر استعمال کرنے والوں کی گنتی بہت کثیر ہو جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ لفظ اب زبان میں داخل ہو گیا۔

نوٹ: آپ کا کوئی سوال اردو روزمرّہ یا صرف کے بارے میں نہیں ہے۔ براہ کرم آئندہ خیال رکھیں، شکریہ۔

(سوالات از: سید ناظم علی، صدر شعبۂ اردو گری راج گورنمنٹ کالج، نظام آباد)

سوال: معرکہ آرا اور معرکتہ الآرا میں کون سا لفظ درست ہے؟ اردو کے ایک مستند عالم نے معرکتہ الآرا کو غلط اور معرکہ آرا کو درست قرار دیا ہے؟

جواب: عربی قاعدے کے اعتبار سے معرکتہ الآرا بے شک غلط ہے۔ لیکن بہت سے لوگ معرکتہ الآرا ہی لکھتے بولتے ہیں۔ میں خود معرکہ آرا لکھتا بولتا ہوں لیکن رواج عام کے باعث معرکتہ الآرا کو بھی درست سمجھتا ہوں۔

سوال: خط و خال اور خدوخال کے بارے میں وضاحت فرمائیں کہ کون سا درست ہے۔ یا دونوں ہی کو استعمال کرتے ہیں؟

جواب: خدوخال/ خال و خد فارسی میں نہیں ملتا، لیکن بہت سے جدید شعرا نے استعمال کیا ہے۔ یہ اردو کا فقرہ ہے، فارسی میں نہ ہو، نہ سہی۔ اردو میں اسے درست مانا جائے گا۔ میرے خیال میں خال و خط، خال و خد، خط و خال، خدوخال، سب درست ہیں۔

سوال: تئیں کا لفظ متروک کے ذیل میں رکھا جائے گا، یا اس کا استعمال صحیح ہے؟

جواب: آج کل تئیں کا چلن دوبارہ ہو رہا ہے۔ پچھلے لوگوں نے اسے متروک قرار دیا تھا، لیکن کسی لفظ کو متروک قرار دینا کسی کے اختیار میں نہیں۔ بولنے والے خود فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا لکھیں بولیں گے اور کیا نہیں۔ تئیں کا دوبارہ چلن میں آجانا اس کا ثبوت ہے۔

(سوالات از: محمد صادق رضا مصباحی، المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور، اعظم گڑھ-276404)

سوال: کیا زیرعکس موجودہ دور میں Xerox (زیراکس) بن گیا؟ تصریح فرمائیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟

جواب: اس سوال کا اردو روزمرہ اور صرف ونحو سے کوئی واسطہ نہیں۔ بہرحال، جواب یہ ہے کہ Xerox کا کوئی تعلق اردو فارسی سے نہیں۔ یہ یونانی ہے۔ اردو میں زیرعکس نامی کوئی فقرہ نہیں جس کو Xerox بنا لیا گیا ہو۔ Xerox دراصل ایک کمپنی کا ٹریڈ مارک ہے جس نے زیراکس مشین سب سے پہلے بنائی۔ یونانی Xero... کے معنی ہیں "خشک"، اور یونانی Graphy کے معنی ہیں "لکھنا"۔ چونکہ زیراکس میں جو روشنائی استعمال ہوتی ہے وہ خشک پاؤڈر کی شکل میں ہوتی ہے اس لیے جس عمل کے ذریعے زیراکس کیا جاتا ہے اسے زیروگرافی (Xerography) کہتے ہیں۔ مشین بنانے والوں نے وہاں سے لفظ Xerox بنالیا۔ اس کی اردو بنانی ہو تو اسے خشک نگاری کہا جائے گا۔

سوال: ادبی اصطلاح اور عام اصطلاح میں کیا فرق ہے؟

جواب: بنیادی لفظ اصطلاح ہے۔ پھر ہم طرح طرح کی اصطلاحوں میں تفریق کرتے ہیں۔ اردو میں اصطلاح کے معنی ہیں وہ لفظ جو ایسے معنی میں استعمال کیا گیا ہو جو کسی علم یا کسی عمل سے مخصوص ہو۔ مثال کے طور پر، ٹورک (Torque) مشینیات کی اصطلاح ہے جس سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ دھرے (axle) کے بل پر، یا کسی اور سہارے کے ذریعے کسی چیز کو گردش دینے کی طاقت۔ اسی ٹورک کو جب پہیے میں پہنچاتے ہیں تو وہ رفتار بن جاتا ہے۔ اسی طرح، غزل ایک ادبی اصطلاح ہے، یعنی ادب میں ایک مخصوص معنی میں استعمال ہوتی ہے، اور کہیں اور نہیں استعمال ہوتی۔ اسی طرح، ردیف، قافیہ، غزل کی اصطلاحیں ہیں اور پلاٹ، کردار، بیانیہ کی اصطلاحیں ہیں۔

سوال: اردو میں ہر دن کتنے نئے لفظوں کا اضافہ ہوتا ہے؟ الفاظ کے متروک ہونے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: اردو میں کتنے نئے لفظ ہر دن، یا ہر مہینے، یا ہر سال داخل ہوتے ہیں، اس کا کوئی تخمینہ موجود نہیں ہے۔ جہاں تک سوال لفظوں کو متروک کرنے کا ہے، تو ایک مدت تک استاد شعرا اپنے اپنے طور پر الفاظ کو متروک قرار دیتے رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ سلسلہ بند ہے۔ لفظوں کے متروک ہوجانے کی بہت سی وجہیں ہیں۔ مثلاً یہ تو سامنے کی بات ہے کہ جس فن کا اب وجود نہیں رہ گیا (مثلاً تیراندازی) اس سے متعلق سب نہیں تو اکثر الفاظ اور اصطلاحیں متروک ہوجائیں گی۔ لیکن لسانیات کے اصول کے طور پر الفاظ کے متروک ہونے یا متروک کیے جانے کی کوئی تھیوری نہیں ہے۔ اگر متروک کا ترجمہ Obsolete کیا جائے تو انگریزی میں اس لفظ کو Obsolete قرار دیتے ہیں جو گذشتہ کم سے کم سو برس سے استعمال نہ ہوا ہو۔

(سوالات از: محمد ناظم علی، ایل بی ایس نگر، نظام آباد 503002)

سوال: ان میں سے کس لفظ کا مذکر بن سکتا ہے؟ چیل، لومڑی، چیونٹی، بطخ؟

جواب: کسی کا بھی نہیں۔ لومڑی کے نر کے لیے لومڑ کا لفظ ہے، لیکن یہ مستعمل نہیں۔ چیونٹا کو چیونٹی کا مذکر نہیں کہہ سکتے۔ چیونٹا، بڑی جسامت کی چیونٹی کی نسل کے جانور کو کہتے ہیں۔ اہل دہلی اسے مکوڑا کہتے ہیں۔

سوال: ان میں سے کون سا لفظ مشتق نہیں ہے؟ موتی، مغل، پانی، دہی؟

جواب: آپ کا سوال سمجھ میں نہیں آیا۔ کس چیز سے مشتق اور کس بنا پر مشتق؟ بہرحال، یہ چاروں لفظ مذکر ہیں، لہٰذا ان معنی میں یہ ایک طرح کے لفظ ہیں۔

سوال: بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

مندرجہ بالا شعر میں کس صنعت کا استعمال کیا گیا ہے؟

جواب: یہ سوال بلاغت کے علم سے اور میرے موضوع سے خارج ہے۔ خیر، جواب ملاحظہ ہو۔ اس شعر میں کم سے کم حسب ذیل صنعت ہے: تلمیح، علاوہ ازیں، اس میں علم بیان کے مندرجۂ ذیل اجزا بکار لائے گئے ہیں: استعارہ؛ مجاز مرسل۔

معاف فرمائیے آپ کے سوالات میں امتحانی پرچے یا پہیلی بجھانے کی سی کیفیت ہے۔ ایسے سوالوں کا جواب دینے پر میں مکلف نہیں ہوں کہ اس طرح کے سوالات سے نہ عام قاری کو فائدہ ہوگا نہ سوال کنندہ کو۔ براہ کرم سوال اس طرح پوچھنے سے پرہیز کریں کہ امتحانی پرچے یا پہیلی بجھانے کا تاثر پیدا ہو۔

(سوالات از: شاداں سلطان پوری، بھٹی جرولی، کناواں، سلطان پور)

سوال: باپ، چچا، استاد، راجا وغیرہ مذکر ہیں۔ ان کی تانیث ماں، چچی، استانی، رانی ہیں مگر بھائی کی تانیث بہن کیوں کر ہے؟ ان کا رشتہ بھائی بہن کا ہے۔ لہٰذا بھائی کی تانیث بھابی اور بہن کا مذکر بہنوئی ہونا چاہیے۔ صحیح کیا ہے؟

جواب: جیسا کہ میں پہلے کئی بار عرض کر چکا ہوں، زبان کے معاملے میں قیاس نہیں چلتا۔ جو لفظ جس طرح رائج ہوجائے اسی طرح صحیح مانا جائے گا۔ لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ آپ نے مسئلے پر شاید پوری طرح غور نہیں کیا۔ لفظ باپ مذکر ضرور ہے لیکن لفظ ماں اس کی تانیث نہیں ہے بلکہ وہ ایک الگ لفظ ہے۔ اسی طرح، چچا کی تانیث چچی نہیں ہے بلکہ چچا کی بیوی کو چچی کہا جاتا ہے۔ استاد کی تانیث استانی ضرور ہے لیکن اگر کسی قاعدے کا اطلاق کیا جاتا تو استاد کی تانیث استادنی ہونا چاہیے تھی۔ اغلب ہے کہ شیر/شیرنی، ریچھ/ریچھنی وغیرہ کے طرز پر استاد/استادنی بن گیا پھر شاید استادنی میں سے د حذف ہوگئی اور استانی رہ گیا۔ راجا کی تانیث رانی نہیں ہے بلکہ راجا کی بیوی کو رانی کہتے ہیں یا پھر اگر کسی ملک پر عورت حاکم ہو تو اس حاکم کو بھی رانی کہہ سکتے ہیں۔ یہ دو الگ

الگ لفظ ہیں۔ بالکل اسی طرح بھائی اور بہن دو الگ الگ لفظ ہیں۔ بھائی کی تانیث بہن نہیں ہے اور بھابی کا لفظ بھائی کی تانیث نہیں ہوسکتا کیونکہ دراصل یہ ''بھائی کی بی بی'' کا مخفف ہے۔ بہنوئی کا لفظ بہن کی تذکیر نہیں ہوسکتا کیوں کہ بہن ایک مستقل علم ہے جس کو تذکیر درکار نہیں۔

میں یہ بات دوبارہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زبان میں قیاس بہت کم چلتا ہے اور اردو میں تذکیر اور تانیث کے لیے مستحکم قاعدے بہت کم ہیں اور جو تھوڑے بہت قاعدے ہیں بھی، ان میں درجنوں نہیں سینکڑوں مستثنیات ہیں۔ لہٰذا ان معاملات میں رواج عام کو قیاس پر فوقیت ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے ''واجب الاحترام اُساتذۂ کرام''۔ حالانکہ استاد کی جمع اساتذہ ہے بفتح الف نہ کہ بضمہ الف، مگر لوگ مانتے نہیں۔

جواب: استاد کی جمع اَساتذہ ہے نہ کہ اُساتذہ۔ یعنی پہلے الف پر زبر یعنی فتحہ ہے نہ کہ پیش یعنی ضمہ۔ جو لوگ ''اساتذہ'' کو مع اوّل مضموم ادا کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

سوال: ''کس'' کی جمع ''کن'' ہونی چاہیے۔ مگر مستعمل تو ''کس'' ہی ہے، کیا یہ غلط نہیں ہے؟

جواب: کس کی جمع کن ہے اور شاید کسی خاص صورت حال میں کن کی جگہ کس سے کام چل جائے ورنہ عام طور پر کس کی جمع کن استعمال کی جاتی ہے۔

مثال-1: آپ کو کس بات پر اعتراض ہے/ آپ کو کن باتوں پر اعتراض ہے۔

مثال-2: یہ کاغذ کس چیز سے بنا ہے/ یہ کاغذ کن چیزوں سے بنا ہے۔

مثال-3: میرا کوئی دوست نہیں، میں کس کے پاس جاؤں۔

مثال نمبر 1 اور مثال نمبر 2 میں کس کی جگہ اور کن کی جگہ متعین ہے۔ کس کی جگہ کس اور کن کی جگہ کن اپنے اپنے معنی میں قائم ہیں اور نہ کس کو کن سے بدل سکتے ہیں اور نہ کن کو کس سے بدل سکتے ہیں۔ تیسری مثال میں ممکن ہے کہ ''میں کس کے پاس جاؤں'' کی جگہ ''میں کن کے پاس جاؤں'' لکھ یا بول دیا جائے لیکن اسے اچھی اردو نہیں کہا جائے گا۔ یہاں پر ''کس'' میں عمومیت ہے اور اس سے جمع مراد ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ لیکن اگر واحد مراد ہی نہیں ہے تو ''کن لوگوں کے پاس جاؤں'' کہنا بہتر ہوگا۔

سوالات از: عبدالرشید ٹھاکر، معرفت عبدالغنی ٹھاکر، رشید ہاؤس بلسی دار (ورینگ)، اننت ناگ جموں اینڈ کشمیر-192212

سوال: صیہونیت اور صہیونیت میں کسے صحیح تسلیم کیا جائے اس کا استعمال اور صرفی اہمیت کیا ہے؟

جواب: صحیح لفظ صہیونیت ہے یعنی ص پر زبر اور واؤ معروف۔ فارسی میں اول مکسور ہے۔ یہ لفظ صہیون سے نکلا ہے۔ صہیون فلسطین میں ایک پہاڑی کا نام ہے جس پر حضرت سلیمان نے اپنا ہیکل تعمیر کیا تھا۔ علاوہ ازیں، صہیون پورے فلسطین یا فلسطین کے اندر اس علاقے کو بھی کہتے ہیں جسے یہودی اپنا آبائی اور قدیمی وطن قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے انھیں مصر سے لاکر یہاں بسایا تھا۔ لفظ صہیون دراصل عبرانی ہے، (Zion)۔ اس کا عبرانی تلفظ زایون ہے (واؤ معروف)۔ چونکہ عبرانی زکی آواز یونانیوں اور عربوں کو بھی کچھ ت+س سے ملی جلی سنائی دیتی ہے، اس لیے عبرانی زایون کو یونانی میں Tsion اور عربی میں صہیون کہا گیا۔ صہیونیت سے مراد ہے وہ اصول یا نظریہ جس میں یہودیوں کی ہر بات کو دوسروں کی بات پر فوقیت دی جائے اور یہودیوں کے ہر دعوے کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ کبھی کبھی ''صہیونی مزاج'' کا فقرہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ یعنی فلاں شخص کے مزاج میں وہ چیزیں ہیں جو یہودیوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ Zionism یعنی صہیونیت کو یہودی لوگ اچھے معنی میں لیتے ہیں لیکن عربی فارسی اردو وغیرہ میں یہ منفی معنی میں بولا جاتا ہے۔

سوال: مستضعفین کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مصدر اور اس کے خاندان کے چند الفاظ بطور مثال بتائیے۔

جواب: اس لفظ کا مادہ ض ع ف ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں دوہرا کرنا اور اس لیے اس کے معنی نکلے کمزور کرنا کیوں کہ بوجھ لوگ جھک کر دوہرے ہو جاتے ہیں۔ ض ع ف کو باب استفعال میں لے گئے تو استضعاف حاصل ہوا۔ جس کے معنی ہیں کسی کو ضعیف (کمزور) بنانا یا ضعیف (کمزور) خیال کرنا۔ اس کا اسم مفعول مستضعف ہے (م مفتوح اور ت مفتوح اور عین مفتوح) اس کے معنی ہوئے، جس کو کمزور قرار دیا جائے۔ یعنی آج کے محاورے میں سماج کا وہ فرد یا طبقہ جو پچھڑا ہوا اور مراعات سے محروم ہو اسے مستضعف کہا جائے گا۔ یہ لفظ فارسی میں امام خمینی نے عام کیا۔ ان کی تعلیم تھی کہ اسلام کمزوروں کا یعنی مستضعفین کا ساتھی ہے اور ان کی بہبودی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔

سوال: شرمندگی دلانا صحیح ہے یا شرمندہ کرنا درست ہے؟

جواب: شرمندگی دلانا کوئی محاورہ نہیں ہے، شرمندہ کرنا محاورہ ہے۔ شرم دلانا بھی محاورہ ہے۔ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔

(سوالات از: اسمٰعیل خاں، راج پورہ پار پٹن، راج پورہ، دلکاپور، بلڈانہ، مہاراشٹر)

□□□

پتہ:
29-C, Hastings Road
Civil Lines
Allahabad (U.P.)

ایم.آئی.ساجد

پرائمری سطح پر اردو کا نثری نصاب

کسی زبان کو سکھانے، پڑھانے اور سمجھانے کے لیے اس کی ابتدائی منصوبہ بندی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ بچہ جب ماں کی آغوش سے نکل کر اسکول یا مدرسے کی دہلیز پر اپنا پہلا قدم رکھتا ہے تو نفسیاتی طور پر پریشان رہتا ہے۔ ایسے میں استاد کی شفقت اور مدرسے کا ماحول اس کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے ہیں اور جب بچہ اسکول میں پہلی مرتبہ کچھ سنتا یا بولتا ہے تو وہ ہوتی ہے نثر۔ کسی بھی زبان کو شروع سے سیکھنے کے لیے نثر ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا نصاب میں خصوصاً پرائمری یا پرائمری سطح پر نثر کی اہمیت مسلم ہے۔ آج کے تیز رفتار دور میں پرائمری سطح پر نصاب کی درسی کتابوں کی تیاری میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ آج کے بچے کی سوچ اور فکر پہلے کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔ آج ملک کے طول وعرض میں پرائمری سطح پر کئی طرز کے نصاب اول تا چہارم، سرکاری اور آزادانہ طور پر تیار کیے جارہے ہیں اور پڑھائے بھی جارہے ہیں، جیسے این.سی.ای.آر.ٹی.، ترقی اردو بیورو، نیشنل بک ٹرسٹ، گلشن اردو علی گڑھ، بھوپال سے ڈاکٹر اخلاق اثر کا تیار کردہ پرائمری نصاب اردو وغیرہ۔ مہاراشٹر میں بال بھارتی پونے کا تیار کردہ نصاب جملہ مدارس میں پڑھایا جاتا ہے جو اول سے بارھویں جماعت تک کا احاطہ کرتا ہے۔

درجۂ اول: بال بھارتی پونے کی درجۂ اول کی کتاب ''بال بھارتی حصہ اوّل'' پورے مہاراشٹر میں پڑھائی جارہی ہے: اس میں پہلا ہی سبق جملاتی طریقہ کا غماز ہے اب کب سب وغیرہ اور بہت آگے جا کر حروف تہجی دیے گئے ہیں جبکہ سب سے پہلے بچے کو حروف تہجی ہی کی پہچان کرانی ضروری ہوتی ہے۔ جب تک بچہ حروف کو صحیح آوازوں کے ساتھ نہیں پہچانے گا، ذہن نشین نہیں کرے گا بات نہیں بنے گی۔ وہ استاد کے پڑھائے ہوئے مرکب اور مفرد لفظوں اور جملوں کو یاد کرے گا لیکن حروف کی مکمل پہچان سے قاصر رہے گا۔ ایک سروے کے مطابق 90 فیصد اساتذہ نے حروف تہجی کی اولیت کو ترجیح دی ہے اور ابتدائی جماعت کے طلبہ کے لیے یہی طریقہ کار درست بھی ہے۔ آج سے 40-30 برس پہلے کی اول جماعت کے نصاب میں بھی اسی طریقے کو فوقیت دی گئی ہے۔ حروف تہجی کی مکمل شناخت کے بعد بچے کو اعراب (زیر۔ زبر۔ پیش، تشدید اور جزم) وغیرہ کی ضرورت و اہمیت سے واقف کرایا جائے پھر متحرک و ساکن الفاظ بتائے جائیں پھر اس کے بعد دو حرفی سہ حرفی و چار حرفی، مفرد و مرکب و مشترک الفاظ سے روشناس کرایا جائے تو طلبہ بہت جلد اردو عبارت کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ بال بھارتی درجۂ اوّل کے نصاب کے جاری ایڈیشن میں تعلیمی نصاب بہتر بتانے کے تعلق سے لکھا گیا ہے کہ: ''پچھلے چالیس پچاس برسوں میں بڑے پیمانے پر تعلیم کا فروغ ہوا ہے لیکن مختلف ریاستوں کے اور اسی طرح ریاست کے مختلف مدارس کے معیار تعلیم میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ پرائمری تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو کیا آنا چاہیے اس نکتے پر غور کرنا ہی دراصل اکتسابی صلاحیتوں پر غور کرنا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ طلبہ زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں حاصل کریں۔''

(بال بھارتی درجہ اول 2005 پونہ)

اس کتاب میں مختلف قسم کی مشقیں، سرگرمیاں اور عملی کام دیے گئے ہیں اور انھیں انجام دینے کے لیے ہدایات بھی دی گئی ہیں جیسے بچوں کو سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا آنا چاہیے۔ روزمرہ میں استعمال میں آنے والے ذخیرۂ الفاظ کی معلومات ہونی چاہیے۔ اساتذہ کو ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ طلبہ سے کس طرح کام کروائیں۔ تصاویر کے ذریعے حروف اور چیزوں کو پہچاننے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ استاد صحیح طریقے سے حروف اور الفاظ کو بار بار دہرائے پھر بچوں سے کہلوائے۔ اعراب کے ساتھ ساتھ حروف کو توڑنے، جوڑنے اور نئے الفاظ بنانے پر کچھ اور مشقوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر اول جماعت کے طلبہ کے لیے اس کتاب کا نثری حصہ بہت کارآمد ہے۔

درجۂ دوم: بال بھارتی درجۂ دوم کی درسی کتاب بھی درجۂ اول کے طریقۂ کار کی تجدید کرتی ہے۔ اس میں عملی کام پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مشقیں بڑھا دی گئی ہیں اور ہدایات کی جگہ اسباق کے بارے میں سوالات دیے گئے ہیں۔ کتاب 98 صفحات پر مشتمل ہے نثر کے کل 25 اسباق کے علاوہ چار مکالمے مع سوالات و جوابات اور چار جگہ آزمائشی پرچوں کے ساتھ تصویر خوانی بھی ہے۔ اسباق دلچسپ، سبق آموز اور ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ کچھ اسباق ایسے ہیں جو برسوں سے قصے، کہانیوں کی صورت میں گھر کے بڑے بوڑھے سناتے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشکل الفاظ کے معنی، ان کی مشق، سابقے اور لاحقے بھی آسان طریقے سے بتائے گئے ہیں، جملوں میں استعمال، رنگوں کی پہچان، بات چیت کرنے کا طریقہ، تختۂ سیاہ کا استعمال، کتاب خوانی، حروف تہجی کو دہرانے کے طریقے غرض کہ بہت ساری مشقیں اور اصول اس کتاب میں یکجا کردیے گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ اگر اس کتاب

میں تجسس بڑھانے والے اسباق، دلچسپ قصے، کسی معروف کھلاڑی کا خاکہ، سائنسی ایجادات پر مبنی کوئی مضمون وغیرہ بھی رکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔

درجۂ سوم: درجۂ سوم کے لیے تیار کی گئی بال بھارتی پونے کی درسی کتاب سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں نثر کے کل 19 اسباق اور ایک ڈراما شامل ہے۔ مختلف موضوعات پر دیے گئے مضامین اچھے ہیں۔ زیادہ تر مہاراشٹر کے کلچر اور ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مذہب، سائنس، اخلاقیات، تاریخ، بہادری، تہوار اور تہذیبی پہلوؤں پر توجہ دی گئی ہے۔ اسلوب نگارش سادہ اور دلنشیں ہے۔ دلچسپی کے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے تا کہ طلبہ شوق سے پڑھ سکیں اور بہت سی باتیں یاد رکھ سکیں۔ ایڈیٹوریل میں لکھا گیا ہے کہ:

''اگر طالب علم آسانی کے ساتھ غلطی کیے بغیر اور مناسب رفتار سے متوقع عمل کرتا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے متعلقہ صلاحیت پر عبور حاصل کرلیا ہے۔ مطلوبہ صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے حسب ضرورت تدریس کی رفتار کم یا زیادہ کی جاسکتی ہے۔ اعادہ نئی سرگرمیوں اور مختلف مشقوں وغیرہ کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔''

(بال بھارتی درجہ سوم 1997 پونہ)

ہر سبق کے بعد الگ الگ طریقے کی مشقیں دی گئی ہیں جن سے بچوں کو اردو زبان کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ آخر میں ایک آزمائشی پرچہ بھی دیا گیا ہے۔ بولنا، سننا، لکھنا، پڑھنا، ذخیرۂ الفاظ اور روزمرہ زندگی میں زبان کس طرح استعمال کی جائے پھر اس میں اپنے طور پر کس طرح اضافہ کیا جائے ان باتوں پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس جماعت میں اس بات پر بھی زور دیا جانا ضروری ہے کہ طلبہ خطوط نگاری، اس کے اصول وضوابط اور انداز سے بھی واقف ہو جائیں ساتھ ہی مضمون نگاری کی طرف بھی اسی جماعت سے پیش رفت ضروری ہے۔ جنرل نالج کی طرف بھی رجوع کیا جانا چاہیے۔

درجۂ چہارم: پرائمری سطح پر درجہ چہارم کی کئی اعتبار سے بڑی اہمیت ہے۔ اس درجہ میں آنے والے طلبہ تین برس کا تعلیمی تجربہ رکھتے ہیں، عملی کام کے لیے تیار رہتے ہیں، ٹیسٹ اور امتحان دینے کی مشق مکمل ہوتی ہے پھر انھیں یہ بھی علم ہوتا ہے کہ چہارم کا امتحان بورڈ سے ہوتا ہے اس لیے بھی وہ لکھنے پڑھنے اور اپنے آپ کو آزمائشوں سے گزارنے کے لیے شعوری اور لاشعوری طور پر تیار رہتے ہیں۔ درجۂ چہارم کے طلبہ کو نہ صرف لکھنا، پڑھنا اور بولنا صحیح طریقے سے آجانا چاہیے بلکہ نثر کے بنیادی اصولوں اور زبان کے طور طریقوں کو بھی پوری طرح سیکھ اور سمجھ لینا چاہیے کہ مستقبل میں یہ ان کے لیے نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔

طلبہ اول تا چہارم جس اسباق کا مطالعہ کرتے ہیں وہ زندگی بھر ان کے لیے کسی قیمتی سرمایے سے کم نہیں ہوتا۔ خصوصاً درجہ چہارم کئی اعتبار سے طلبہ کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ اس درجے میں بچوں کی صلاحیتوں کو بڑھاوا دینے کے تعلق سے کتاب کے پیش لفظ میں درج ہے کہ:

''اگرچہ طلبہ میں پیدا ہونے والی صلاحیتیں انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن ان کے حصول کا عمل اجتماعی ہوتا ہے۔ اس طرح کی تدریس سے دو فائدے ہونے کی امید ہے۔ پہلا معیار میں یکسانیت کا پیدا ہونا اور دوسرا اکتساب میں اجتماعی جذبے کا بڑھنا۔''

(بال بھارتی درجہ چہارم دسمبر 2001، پونہ)

درجہ چہارم کی اس درسی کتاب میں بطور نثر 11 مضامین، ایک تقریر، ایک مکالمہ، ایک ڈراما (دو حصوں میں) اور چار آزمائشی پرچے ہیں۔ پوری کتاب 116 صفحات پر مشتمل ہے۔ نثر کی معروف اصناف کو اس میں سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ فن تقریر کے ساتھ خط کا بھی نمونہ دیا گیا ہے۔ مضمون نویسی کی مشق بھی ضروری تھی جو نہیں دی گئی۔

بال بھارتی کی ان اول تا چہارم جماعت کی درسی کتاب کے نثری حصے پر غور کیا جائے تو یہ چاروں کتابیں کئی اعتبار سے افادیت کی حامل نظر آتی ہیں۔ نصاب تعلیم کا بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ تاثر پذیر تبدیلیوں سے دوچار ہوتے رہنا از بس ضروری ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے این سی ای آر ٹی نے پہلی سے بارھویں جماعت کے طلبہ کے نئے نصاب کی تیاریاں شروع کی ہیں۔ ایک ایسا نصاب جس میں طلبہ کی تمام ضرورتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہو۔ اس ضمن میں نور جہاں ثروت لکھتی ہیں: ''این سی ای آر ٹی کے ذمہ داروں کے مطابق نئے نصاب میں کئی ایسی دلچسپ اور معلوماتی تفصیلات شامل کی جارہی ہیں جنھیں پڑھنے سے بچوں میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہو۔ نصاب کو نئی شکل دینے والی کمیٹی کے سربراہ اور یو جی سی کے سابق چیئرمین پروفیسر یشپال کے مطابق حکومت چاہتی ہے کہ تعلیم کو ذہنی تناؤ سے دور رکھا جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ تعلیم حاصل کرنے کے نام پر بچے خوف وہراس محسوس نہ کریں اور ایسا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب نصاب دلچسپ اور آسان ہو۔''

(روزنامہ انقلاب ص 29 نومبر 2005، ممبئی)

امید کی جاسکتی ہے کہ اس نئے نصاب کے رائج ہوجانے پر پرائمری سطح پر نثر کی درس وتدریس میں بھی معیاری پیش رفت ہوگی اور طلبہ اس نئے نصاب سے پوری طرح استفادہ کرسکیں گے۔

پتہ:
Opp. N.P. Urdu Pry. School,
Zia Colony, Khamgaon, (M.S.)

قدسیہ اختر

اردو ذریعۂ تعلیم — مسائل اور حل

عہد مغلیہ کے چار سو سالہ دور میں سرکاری زبان فارسی رہی۔ امرا، رؤسا اور خواص بھی فارسی کے دلدادہ تھے لیکن عوام کی زبان یہی لشکری زبان تھی جسے اردو کہتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ ہندی کا بھی رواج رہا جو اردو کے بین بین لکھی اور پڑھی جاتی رہی۔ ہندی داں افراد نے وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے فارسی بھی سیکھی اور اہل زبان کی سی قدرت حاصل کی۔ اس میں لکھا بھی پڑھا بھی لیکن اپنی زبان کو فراموش کبھی نہیں کیا۔ اپنے گھر میں بچوں کو برابر ہندی لکھاتے اور پڑھاتے رہے۔ ذریعۂ معاش کے لیے فارسی اور اردو کی لیاقت بھی بہم پہنچائی اور ساتھ ہی اپنی مادری زبان ہندی کو بھی گلے سے لگا کر رکھا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ جب اس کو حکومت کی ذرا سی سرپرستی حاصل ہوئی تو یہ زبان ایک دم بام عروج پر پہنچ گئی لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔ وہ اس طرح کہ جب ہندی کا چلن عام ہوا اور اسکولوں میں ہندی میڈیم سے پڑھایا جانے لگا تو ہم نے اپنے بچوں کی صرف اسکولی تعلیم پر ہی قناعت کر لی اور اپنی زبان کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نئی نسل نہ صرف اردو زبان سے بیگانہ ہو گئی بلکہ اپنی زبان کو مشکل سمجھنے لگی۔ ہمارا دوسرا قصور یہ ہے کہ ہم نے بچوں کی تعلیم کے لیے ابتدا ہی میں انگریزی زبان کو ضروری سمجھا اور بیشتر والدین نے اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کر کے ان کا اردو سے سلسلہ ہی منقطع کر دیا۔ ایسے والدین کے نظریے کے مطابق اعلیٰ تعلیم کے لیے سائنس، ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس اور انجینئرنگ کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے اس لیے ابتدا ہی سے بچے کو وہ تعلیم دی جائے جو اس کے مستقبل سنوارنے میں کام آئے۔ یہ خالص مادی و اقتصادی مسئلہ ہے۔

دور حاضر میں وہی تعلیم پسندیدہ اور لائق توجہ ہے جو مادی اور اقتصادی مسائل کو حل کر سکے اس کا حل دو زبانوں میں نظر آیا ایک ہندی دوسرے انگریزی میں اس لیے انھوں نے اردو کو غیر ضروری سمجھ کر اس سے صرف نظر کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جو مواد انگریزی میں دستیاب ہے وہ ہندی میں بھی نہیں چونکہ یہ سارے علوم مغرب کا عطیہ ہیں اور مغرب میں ذریعۂ تعلیم اردو یا ہندی نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اپنی زبان سے بالکل ہی بیگانہ ہو جائیں جو زبان ہم بولتے ہیں جو ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اسے اگر ہم چھوڑ دیں گے تو دوسرے معنی میں ہم اپنی تہذیب سے بھی بیگانہ ہو جائیں گے۔ ہمارا ادبی ادب اور مذہبی ورثہ بھی ہماری اپنی زبان میں ہی محفوظ ہے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ انگریزی اور ہندی کے ساتھ ساتھ بچوں کو اپنے گھروں میں اپنی مادری زبان کی بھی تعلیم بلکہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ زبان بچوں کے لیے کسی دوسری زبان سے زیادہ آسان ہوگی۔ ریاست کے زمانے میں بھوپال میں ابتدائی درجہ سے بائی اسکول تک دو زبانوں میں تعلیم دینے کا رواج تھا جن کی مادری زبان ہندی تھی وہ سائنس ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ ہندی زبان میں پڑھتے تھے اور جن کی مادری زبان اردو تھی وہ یہی مضامین اردو میں پڑھتے تھے جس کے نتیجے میں بائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنی زبان میں اچھی خاصی استعداد حاصل کر لیتے تھے جو ان کی ثانوی تعلیم میں معاون ثابت ہوتی تھی۔

عہد حاضر میں ابتدائی درجات میں اردو پڑھانے لکھانے پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور جو اساتذہ مقرر ہیں وہ بھی اپنی ذمے داری پوری نہیں کرتے۔ نتیجتاً بایئر کلاسیز میں جو بچے اردو کو بحیثیت مضمون پڑھنا چاہتے ہیں ان کا نہ تو املا درست ہوتا ہے نہ انھیں اردو لکھنے کی مشق ہوتی ہے اردو کے حروف اور کشش بھی صحیح طور سے نہیں آتی۔ اس میں سب سے زیادہ نقصان اس نظریہ سے پہنچا کہ اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے۔ دیوناگری رسم الخط سے اردو پڑھنے والوں کو اردو الفاظ سے تو بھلے ہی واقفیت ہو جائے لیکن وہ اس سے بالکل نابلد رہتے ہیں کہ یہ لفظ س، ص، ث، ز، ض اور ظ سے ہے۔ اس سے زبان کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً الم اور علم جو مختلف معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ان کو کس طرح ظاہر کریں گے۔ بقول ڈاکٹر ابومحمد سحر (مرحوم): ''رسم الخط میں جسم و جان کا سا ربط و تعلق ہوتا ہے۔'' نامور ادیب رسم الخط سے دست برداری کو اردو زبان اور اس کے پورے ادبی اثاثے کا خاتمہ تصور کرتے ہیں۔ سید حامد نے اردو رسم الخط کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے خطرات کی بڑی خوش اسلوبی سے وضاحت کی ہے۔

(کتاب نما، ص۔6، دسمبر 1999، شمارہ نمبر 120)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ رسم الخط کی تبدیلی کے بعد ہم اصل لفظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر لفظ ''معیار'' ہی لے لیجیے۔ جو رسم الخط سے

واقف ہیں اس لفظ کے سنتے ہی اس کے معنی ان کے ذہن میں آجائیں گے اور اس کی ادائیگی بھی ان سے صحیح ہوگی۔ یہ لفظ اگر ہم دیوناگری میں لکھیں گے تو وہ بات پیدا نہ ہوگی یا مثال کے طور پر اگر ہمیں لفظ بعینہٖ لکھنا ہے جو اردو زبان میں مستعمل ہے تو دیوناگری میں اس کا لکھنا نہ صرف مشکل ہوگا بلکہ اس سے اس کا مفہوم پانا بھی مشکل ہوگا۔ ہمارے موجودہ مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ بائیر کلاسیز میں بھی جہاں طلبہ کو ان باتوں سے واقفیت ہونی چاہیے وہاں ہمیں ابتدائی درجوں کی طرح ان کو سکھانا اور بتانا پڑتا ہے۔ غور فرمائیے کہ ایک طالب علم بی اے میں اردو ادب کو مضمون کے طور پر لیتا ہے لیکن بنیاد کمزور ہونے کی وجہ سے نہ اس کا املا درست ہے نہ معنی سے واقفیت ہے تو بی۔اے۔ کے معیار پر لانے کے لیے ہمیں کتنی محنت کرنی پڑے گی۔ جب کہ ہمیں غالب، مومن، اقبال، محمد حسین آزاد، شبلی، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری وغیرہ کو نہ صرف پڑھانا پڑتا ہے بلکہ ان پر تنقیدی سوالات بھی تیار کرانا ہوتے ہیں۔ یہاں ہمیں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ جس طالب علم کو صحیح طور سے پڑھنا اور لکھنا نہ آئے اسے اس معیار پر کیسے لایا جائے۔ بہرحال کوشش تو کرنی پڑتی ہے یہ طالب علم کی اپنی استعداد پر منحصر ہے کہ وہ کتنا سمجھ پاتا ہے۔ یہاں میں پروفیسر مختار شمیم کے ایک مضمون'' ثانوی درجات میں اردو کا نصابی تعلیم'' کا حوالہ دینا چاہتی ہوں جس میں وہ لکھتے ہیں:

''اردو کے نصاب کے سلسلے میں میری ذاتی الجھن یہ ہے کہ ثانوی درجات میں نصاب دو طرح کا ہے ایک Higher Urdu Course اور دوسرا Elementary Urdu Course۔ حال ہی میں میں نے اپنے ایک مشفق محترم استاد سے رہنمائی حاصل کرنی چاہی کہ کلی طور پر ثانوی درجات کو ادب پڑھایا جانا چاہیے؟ ان کا فوری جواب تھا کہ ادب تو پڑھایا ہی جانا چاہیے اس لیے کہ ادبی تحریریں زبان و بیان کی قدر و منزلت میں طالب علم کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔''

(ماہنامہ اردو دنیا، جنوری 2001، ص: 23)

زبان و بیان کی قدر و منزلت تو دور کی بات ہے جب کہ زبان اور بیان کو سمجھنے کے ہی لالے پڑے ہوں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں'' اردو دوستوں سے اپیل'' میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

''یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جب تک زبان کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی ادب کا فروغ ممکن نہیں ہے اسی لیے جب تک اردو زبان ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا کما حقہ، انتظام نہیں ہوتا اس وقت تک یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اردو زبان و ادب ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔''

(اردو دنیا، 2001، ص: 10)

اردو ذریعۂ تعلیم کا معیار بڑھانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ والدین اپنے بچوں کو اپنے گھروں پر اردو کی تعلیم دیں انھیں نہ صرف اردو پڑھنے سے دلچسپی پیدا کرائیں بلکہ خوشخطی اور املا کی طرف بھی توجہ دلائیں۔ بچوں کو قصے کہانی کی کتابیں اردو میں پڑھنے کے لیے دیں تاکہ انھیں اردو زبان کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا ہو۔

□□□

پتہ:
Saifya College,
Bhoplal, (M.P)

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110086

ایم۔نسیم اعظمی

عربی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی اداروں کی ضرورت

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زبوں حالی کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں میں دو طرح کی تعلیمی تحریکوں کا آغاز ہوا۔ ایک عصری تعلیم کی تحریک، جس کی رہنمائی سرسید احمد خاں نے کی اور ان کی کوششوں سے علی گڑھ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی) کا قیام عمل میں آیا۔ دوسری مذہبی تعلیم کی تحریک جس کی قیادت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی اور دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید احمد خاں کی تحریک ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے موسوم ہوئی تو مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک ''تحریک دیوبند'' یا تحریک قیام مدارس'' کے نام سے جانی گئی۔ واضح ہو کہ یہ دونوں بزرگ دہلی کالج کے استاد مولانا مملوک علی کے شاگرد رشید اور تحریک ولی اللہی کے علمبردار تھے۔ سرسید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ کے نتیجے میں برصغیر میں عصری تعلیم کے بہت سے ادارے قائم ہوئے تو مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تحریک قیام مدارس کے تحت پورے غیر منقسم ہندوستان میں عربی مدارس کا جال بچھ گیا جس کے نتیجے میں آج ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں عربی مدارس قائم ہیں اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جارہا ہے۔ مدارس کی موجودہ تعداد ایک اندازے کے مطابق تقریباً چھیاسی ہزار (86000) ہے۔

ہندوستان میں عربی مدارس کی اتنی بڑی تعداد اور ان میں درس و تدریس کی خدمات کے لیے مامور ہزاروں اساتذہ کی تربیت کا پورے ہندوستان میں کوئی باقاعدہ ادارہ نہیں ہے جس سے ان مدارس کا تعلیمی معیار روز بروز پست سے پست تر ہوتا جارہا ہے لہٰذا ان حالات میں فی الحال نئے عربی مدارس کے قیام سے کہیں زیادہ عربی مدارس سے درس و تدریس میں وابستہ حضرات کی تدریسی تربیت کے اداروں کے قیام کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ان مدارس کے ایک مرکزی وفاقی ادارے کے قیام کی بھی ضرورت ہے تاکہ آئے دن مدارس پر لگائے جانے والے الزامات کا موثر طور پر جواب دیا جاسکے اور ان مدارس کی تعلیم، معیار تعلیم، مقاصد تعلیم اور طریقہ تعلیم میں یکسانیت اور ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق کی فضا بھی قائم ہو سکے۔

عربی مدارس ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور روحانی تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہیں لیکن تعلیم کے اسی ایک ذریعے سے ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہت تعلیمی ترقی ممکن نہیں ہے اس لیے آج ہندوستان میں جگہ جگہ بنیادی اور ثانوی تعلیم کے مسلم اقلیتی عصری تعلیم کے اداروں کے قیام کی بھی ضرورت ہے تاکہ ملت میں موجود دینی و عصری تعلیم کے عدم توازن کو دور کیا جاسکے۔ اس کے لیے عربی مدارس کے نصاب میں بعض ضروری عصری علوم کی شمولیت اور مسلم اقلیتی عصری تعلیم کے نصاب میں مذہبی اور اخلاقی علوم کی شرکت سے بھی تعلیمی توازن کے قیام میں معاونت حاصل کی جاسکتی ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک متوازن اور معتدل نظام تعلیم کی شدید ضرورت ہے اور ان ضرورتوں کو نظر انداز کرنا حالات کے تقاضوں سے چشم پوشی کرنے کے مترادف ہوگا۔

ہندوستان میں ہزاروں کی تعداد میں قائم عربی مدارس میں مذہبی، اخلاقی، اور نیٹل اور جزوی طور پر عصری مضامین پڑھائے جاتے ہیں اس طرح ہندوستانی دستور کے مطابق ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم اقلیت نے صرف اپنے بل بوتے پر ایک متبادل تعلیمی نظام قائم کر رکھا ہے جہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلم بچے تعلیم حاصل کر کے ملک کو صد فیصد تعلیم یافتہ بنانے کے قومی منصوبے کی تکمیل میں بلا کسی سرکاری صلہ و ستائش کی تمنا کے مصروف عمل ہیں لیکن ان مدارس میں جو اساتذہ درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے ہیں وہ عموماً غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں جس سے یہ عظیم الشان تعلیمی متبادل نظام بے تربیتی، عدم منصوبہ بندی تعلیمی بے جہتی اور طلبہ کے مستقبل کی بے یقینی کا شکار ہوتا جارہا ہے اور قوم و ملت کو مدارس سے جتنا اور جس انداز کا تعلیمی فائدہ حاصل ہونا چاہیے اس میں روز بہ روز کمی واقع ہوتی جارہی ہے لہٰذا ان مدارس میں معلمی کے فرائض انجام دینے والوں کے لیے تربیتی اداروں کے قیام کی ضرورت ہے جہاں مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی کم از کم دو سالہ تربیت کا انتظام ہوتا کہ ان مدارس میں بھی تربیت یافتہ اساتذہ پہنچ کر مدارس کے معیار تعلیم کو بلند کر سکیں اور مسلم بچوں میں موجود فطری صلاحیتوں کو ابھار کر ہندوستانی مسلمانوں کی ایسی باصلاحیت اور حوصلہ مند نسل تیار کر سکیں جس کی آئندہ کے حالات میں شدید ضرورت پڑنے والی ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہزاروں عربی مدارس کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی تیاری کا کام مسلمانوں کے بڑے تعلیمی اداروں کے زیر انتظام بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، ہمدرد یونیورسٹی دہلی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور اسی قبیل کے دوسرے

مرکزی ادارے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی تدریسی تربیت کا اہتمام کر سکتے ہیں۔

مسلم اقلیتی اسکولوں اور عربی مدارس میں تدریسی خدمات پر مامور اساتذہ کی قلیل مدتی تدریسی تربیت کے لیے گذشتہ کئی سال سے سید حامد صاحب (چانسلر ہمدرد یونیورسٹی) کی سربراہی میں جو تربیتی اسکیم چلائی جارہی ہے مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بہتر نتائج سامنے آنے لگے ہیں۔ عربی مدارس اور مسلم اقلیتی اسکولوں کے اساتذہ کو اس تربیتی اسکیم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے اور ان کی انتظامیہ کو بھی ایسے تربیتی پروگراموں میں شرکت کے لیے اساتذہ کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ بعض عربی مدارس کے ذمہ داران اس قسم کے تربیتی پروگراموں میں اپنے اساتذہ کو نہ صرف شرکت کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اسے وقت کا زیاں تصور کرتے ہیں۔ ان کی یہ منفی سوچ دراصل تعلیم کے حقیقی مقاصد سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ مدارس کے اساتذہ کی معلمانہ تربیت آج ملت کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے۔ تعلیم و تدریس کا کام انتہائی اہم کام ہے۔ یہ نسلوں کی تعمیر و تشکیل کا کام ہے۔ جس کے لیے وسیع علم و آگہی کے ساتھ ساتھ بہتر ذہنی تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک اساتذہ کی بہتر تربیت کا انتظام نہیں ہوگا ہندوستانی مسلمانوں میں حصولِ تعلیم کے لیے مزاج سازی اور تعلیمی بیداری نہیں پیدا کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تعلیمی معیار کو روز بروز پست ہونے سے روکا جاسکتا ہے۔

مدارس میں عموماً غریب اور نادار طلبہ ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں جن کا گھریلو ماحول غیر تعلیمی اور سرپرست حضرات عام طور پر ناخواندہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ جن کا گھریلو ماحول قدرے بہتر ہوتا ہے اور خود بھی قدرے خواندہ ہوتے ہیں وہ بھی اپنے اُنھی بچوں کو مدارس میں پہنچاتے ہیں جو ان کی نظر میں جسمانی و ذہنی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں، وہ بچے جو ذہین اور محنتی ہوتے ہیں، عموماً عصری تعلیم کے اداروں میں داخل کرائے جاتے ہیں۔ اس طرح نسبتاً خوش حال گھروں کے جو بچے مدارس میں آتے ہیں وہ بھی بیشتر کند ذہن، بدمزاج اور بداخلاق ہوتے ہیں لہٰذا عربی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کی منصوبہ سازی کرتے وقت ان باتوں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا اور ان کے پیش نظر ہی تربیتی نصاب، عملی طریقۂ کار اور موثر تربیتی اسباق کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی تاکہ ان تربیتی مدارس سے اساتذہ کی جو ٹیم تیار ہو کر نکلے وہ بنیادی اور ثانوی تعلیم کو موثر، مفید اور پرمسرت بنانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کے تعلیمی مرحلوں میں پیش آنے والے مختلف قسم کے مسائل کے حل میں کامیاب ہو۔

عربی مدارس کے لیے اچھے باصلاحیت اور تربیت یافتہ اساتذہ کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے مسلمانوں کی بنیادی اور ثانوی تعلیم کا اہم اور بڑا ذریعہ یہی عربی مدارس ہیں اور ان مدارس میں پیدا ہونے والی تعلیمی کمزوریوں کو بہتر تربیت یافتہ اساتذہ ہی دور کر سکتے ہیں اور معیارِ تعلیم کو بلند اور تعلیم کو بامقصد بنا کر مدارس کے قیام کے اصل مقاصد اور ملت کی موجودہ تعلیمی ضرورتوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے آج کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Domanpura, kasari,
Maonath,
Bhanjan (U.P.) 275101

مرزا سلامت علی دبیر: حیات اور کارنامے

مصنف: مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا سلامت علی دبیر انیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے مرثیہ گوئی کو ایک نئی تب و تاب عطا کی اور ایک منفرد لب و لہجے سے ہم کنار کیا۔ ان پر ابھی تک جو کچھ بھی تحقیقی مواد فراہم ہو سکا ہے وہ بڑی حد تک تشنہ ہے۔ اس کتاب میں دبیر کے حالاتِ زندگی، شعری کارنامے، مراثی کی روایت، کلام دبیر کی اہم خصوصیات، ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کی نشاندہی اور ان کے ادبی مرتبے کے تعین کے ذریعے اس تشنگی کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 592، قیمت -/258 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

سندھیا سنگھ

زبان ایک بہتی ندی

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے، ریختہ کے استاد مرزا اسد اللہ خاں غالب نے آخر یہ کس لیے کہا ہوگا؟ کیا استاد کو بھی بات کے کہنے میں مشکلیں آن پڑی تھیں؟ یقیناً غالب کو بھی مشکلیں آن پڑی تھیں۔ وجہ محبوب کی نکتہ چینی رہی ہو یا پھر زمانے کی، انھیں یہ سب برداشت کرنا پڑا کیوں کہ انھوں نے شاعری کی زبان کو نیا لباس زیب تن کرانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ شاعر نرالا کو بھی زمانے کی نکتہ چینی سہنی پڑی تھی کیوں کہ انھوں نے ''میں'' کے اسلوب میں شاعری کو ڈھالا اور اوزان کی قیود سے آزاد کیا۔ روایت سے انحراف کرنے والے کو مخالفتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

انگلس نے زبان کو، انسان کی عملی ہوش مندی، کہا ہے۔ تصور کیجیے کہ یہ ہوش مندی کسی دہشت کے سائے میں سانس لینے لگے تو زبان کی دہشت، قواعد کی پابندیوں میں جکڑنے لگے تو کیا ہوگا؟ ہوش مندی غلام ہوگی اور اگر ہوش مندی غلام ہوئی تو تالا کھ جتن کریں، بگڑی نہ بنے۔

کئی بار سیدھی سادی بات بھی زبان کے چکر میں پڑ کے پیچ ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً بات بے اثر ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں کتابوں پر کام کرتے ہوئے کنور نرائن کی شاعری ''بات سیدھی تھی'' پر جب دوبارہ نظر ڈالی اور اس پر کچھ لکھنا بھی پڑا تو ذہن میں یہی سوالات اٹھنے لگے، پہلے بات یا پہلے زبان؟ کیا بات کے بغیر زبان اور زبان کے بغیر بات کا وجود ممکن ہے؟ زبان بات کے ماتحت ہوتی ہے یا بات زبان کے ماتحت۔ بات میں زبان کیسی ہو؟ یا زبان میں بات کیسی ہو؟ ہوا میں خوشبو کی طرح کہ بات بن جائے۔

سوال اہم ہے اور برمحل بھی، کیوں کہ زبان کی تدریس ہی تعلیم کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسکول میں پہلا قدم رکھتا بچہ یہ جان سکے کہ زبان پڑھنے کے معنی کچھ جملوں یا الفاظ سے بھرے اوراق محض نہیں۔ زبان پڑھنے کے معنی ہیں فکر اور احساسات سے لبالب، معنویت سے بھرے ہوئے لفظوں کی ایسی دنیا جس میں سارا جہاں ہو، اپنی پوری توانائی کے ساتھ۔ ایسا تب ہوسکتا ہے جب بات اپنی زبان خود طے کرے۔ شاعر شمشیر نے جب کہا تھا..... ''بات بولے گی/ ہم نہیں/ بھید کھولے گی/ بات ہی'' تب وہ کہیں نہ کہیں اس بات کی تائید کر رہے تھے کہ ہر بات اپنی زبان خود طے کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور اہم سوال کہ زبان قواعد کو متاثر کرتی ہے یا قواعد زبان کو؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے عظیم روسی کہانی کار ٹالسٹائے کے اسکول میں چلتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ''ہم نے قواعد پڑھانے کے طرح طرح کے طریقے استعمال کیے، لیکن کسی ایک سے بھی قواعد اور گرامر کی پڑھائی کو دلکش بنانے کا اپنا مقصد نہ پا سکے۔ صحیح لکھنے کے کوئی بھی اصول وضوابط نہیں تھے اور اکثر تھے بھی تو وہ صحیح کم اور غلط زیادہ تھے۔'' جملوں کی آرائش سے متعلق خیالات کا اظہار کرتے ہوئے استاد کو لگاتار طلبہ کے سامنے چالاکی برتنا اور انھیں فریب دیتے رہنا پڑتا ہے جسے وہ اچھی طرح بھانپ لیتے ہیں۔ مثلاً ایک جملہ تھا: ''زمین پر پہاڑ نہیں تھے'' ایک طالب علم نے کہا کہ جملے میں فاعل 'زمین' ہے، دوسرے نے کہا کہ نہیں، فاعل 'پہاڑ' ہے، مگر ہم نے کہا کہ یہ غیر فاعلیہ جملہ ہے اور ہم نے محسوس کیا کہ طلبہ صرف مروت اور تہذیبی لحاظ سے ہی چپ ہو گئے حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ہمارا جواب اطمینان بخش نہ تھا۔

دراصل قواعد وضوابط کوئی ایسے اصول نافذ نہیں کر سکتے جن کا زبان کے عام رواج میں اپنا کوئی وجود نہ ہو۔ زبان ہی قواعد کی ایک متعین سرحد ہے۔ ماہر قواعد کیشوری داس واجپائی کے لفظوں میں کہیں تو ''زبان کی روش کو قواعد بدل نہیں دے گی، یہ اس کی قوت سے باہر کی بات ہے۔'' ہندی ہی نہیں تمام زبانوں کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ زبانیں تبدیلیوں کو ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ جو زبان ایسا نہیں کر پاتی وہ مردہ ہو جاتی ہے جیسا کہ دنیا کی کئی زبانوں کے ساتھ ہوا۔

بہر حال بحث کا اصل موضوع تو یہ ہے کہ طرح طرح کی بندی کیوں؟ اس پر سوچنا ہوگا۔ اور اس عمل میں بات سے زبان اور زبان سے قواعد کے رشتے پر بھی بار بار غور کرنا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچنا ہوگا کہ کیا ہمارا وقت گویائی کی پریشانیوں سے گزر رہا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر یہ سوال کیوں؟ گویا ہندی کسی کنویں سے نکلتی ہوئی آواز ہو۔ ہندی تو آب رواں ہے اس کے بہاؤ میں کئی زبانیں، کئی تہذیبیں شامل ہیں لہٰذا ان میں تاریخی تبدیلیوں کے اثرات کا ہونا لازمی ہے۔

اصل موضوع پر آئیں تو پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ اس مادّی دنیا میں چرند و پرند اور پیڑ پودوں کی اتنی شکلیں کیوں ہیں؟ آپ کہیں گے کہ یہ تو تنوع ہے، آپ یہ بھی کہیں گے کہ ان سب کا اصل ماخذ بھی تو ایک ہی ہے۔ یہ سائنسی سچائی ہے کہ غیر ذی روح سے ہی ذی روح کی تخلیق ہوئی ہے اور ان تمام بوالعجبیوں کی اساس ایک ہی تھی۔ اب آپ ہی بتایئے جب اس عالم وجود

کی ساری بوالعجبیاں سلسلۂ ارتقا کا نتیجہ ہیں تو پھر عالم محسوسات کی بوالعجبیاں بھی تو سلسلۂ ترقی کی ہی دین ہوئیں۔ عہد حاضر میں زبان، آرٹ، سائنس، علم، مذہب، پوشاک، خوراک اسلحے وغیرہ تمام اگرچہ جدا جدا دکھائی دیتے ہیں لیکن ان سب کی اصلی شکل ایک ہی تھی۔ جیسے جیسے ضرورتیں بڑھیں ویسے ویسے ان تمام کی مزید کئی شکلیں وجود میں آئیں۔ یہ تکثیریت بھی تو سلسلۂ ارتقا کا ہی نتیجہ ہے اور الگ الگ۔ ترقی کی پہلی شرط بھی۔ دنیا کی تمام زبانوں کا بھی اصل ماخذ ایک ہی رہا ہے۔ آج ان کی مختلف شکلیں، الگ الگ ذخیرۂ الفاظ اور مختلف اقسام کے قواعد وضوابط ہیں۔

ہندی زبان کی آج کئی شکلیں ہیں اور مستقبل میں وقت کے تقاضے کے مطابق نہ جانے اور کتنی شکلیں وجود میں آئیں گی۔ جوں جوں ہم باہری دنیا کے قریب ہوں گے ہمارے خیالات کے اظہار کی ضرورتیں بھی بڑھیں گی اور اس کی شکلیں بھی مختلف ہوں گی۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کی لفظیات بھی الگ ہو۔ ایک ہی لفظ الگ الگ حوالوں اور معانی میں مستعمل ہونے پر مختلف معانی و مفاہیم دے سکتا ہے خواہ سائنس ہو یا آرٹ یا پھر ادب۔ علم لسان کے مطابق لفظ کی اپنی کوئی حکمرانی نہیں ہوتی۔ معنی ہی لفظ کی قوت ہے لیکن لفظ ہی زبان کے نئے محاورے وضع کرتے ہیں اور معانی کو نئی تابانی عطا کرتے ہیں۔ اس لئے کا اطلاق ہر زبان پر ہوتا ہے بار بار ایک ہی معنی میں مستعمل لفظ اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کتنے ہی الفاظ اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔

ہندی سے ترجمہ اور تلخیص: احمد کفیل

(بشکریہ روزنامہ ''جن ستا''، دہلی، 27 مئی 2007)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی طرف سے

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری

دوسری ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی جو پورے برصغیر میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے، عصری تعلیم سے پوری طرح ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے، صرف انگریزی پر انحصار ٹھیک نہیں کیوں کہ ہندوستان میں انگریزی زبان پر مبنی شہری ماڈل کے ذریعے حقیقی ترقی ممکن نہیں۔ ہمیں مختلف ہندوستانی زبانوں اور اپنی رنگارنگ ثقافت سے طاقت حاصل کرنی چاہیے۔

ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے حیدرآباد میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے دوسرے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کی طرف سے جناب ارجن سنگھ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی۔ ان کے علاوہ گورنر ہریانہ جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی اور قومی اردو کونسل کے وائس چیئر مین جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔ یہ ڈگریاں مولانا آزاد یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب اے۔ ایم۔ پٹھان نے پیش کیں۔ یونیورسٹی کے چانسلر جناب عبید صدیقی بھی اس موقعے پر موجود تھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

”بے در و دیوار“ سید احمد شمیم کا تازہ کلام

سید احمد شمیم کے کمالات شاعری کو دیکھتے ہوئے یہ بات ذرا نا قابل یقین لگتی ہے کہ ان کی اہمیت اور خوبیوں کا وہ اعتراف ابھی تک نہیں ہوا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کی کم سے کم تین وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ اول تو نام و نمود کے اسباب وسائل سے ان کی بے نیازی اور ادبی حلقوں میں تعلقات پیدا کرنے، یا انھیں وسیع تر اور عمیق تر کرنے سے اجتناب، رسالوں اور محفلوں میں شرکت سے عام طور پر گریز، یہ باتیں ایسی نہیں جو فی زمانہ کسی کو شہرت یا مقبولیت کے زینے پر بلند کر سکیں۔ دوسری وجہ ان کی ترقی پسندی ہے۔ میں نے ”ان کی ترقی پسندی“ اس لیے کہا کہ سید احمد شمیم کی ترقی پسندی بھی انھیں کی طرح غیر ہنگامی ہے اور سکہ بند ترقی پسند شاعری کے دائرے میں نہیں آتی۔ ان کے عقائد تو ترقی پسند رہے لیکن شعری طریق عمل میں وہ انفرادیت پسند رہے۔ دنیا کو انھوں نے اجنبی کی آنکھ سے دیکھا، اس اجتماعی آنکھ سے نہیں جو ترقی پسند بوطیقا نے اپنے ہر مقلد کی فطری آنکھ پر عینک کی طرح چڑھا رکھی تھی۔ لہٰذا بااثر ترقی پسند حلقوں میں وہ کم و بیش غیریت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ترقی پسند زعما میں سردار جعفری نے ان کی پذیرائی ضرور کی، لیکن دیر میں، اور اتنی پھر بھی نہیں جتنی آؤ بھگت کے وہ مستحق تھے۔

سید احمد شمیم کی تخلیقی زندگی کے ان خم و پیچ میں ایک نیا پیچ جدیدیت نے پیدا کیا۔ ان کی علیحدگی پسندی تو جدیدیت کے گوں کا پارتھی، لیکن وہ جدیدیت کے ابہام پرست، داخلیت میں شرابور محاورے کو قبول کرنے سے کتراتے بھی تھے۔ چنانچہ اچھی خاصی ذہنی ہم آہنگی کے باوجود نہ جدیدیت انھیں قبول کر سکی اور نہ ہی انھوں نے جدیدیت کے دروازے پر دستک دی۔ انھوں نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ ادب کے میدان میں ایک نئی ہوا بہہ رہی ہے اور یہ ہوا بہت سی پرانی چھتوں، پناہ گاہوں، اور حتیٰ کہ مزعومات کے بہت سے قلعوں کو اڑا لے جانے کے درپے ہے۔ اگر پرانے حصار ٹوٹے نہیں تو بھی ان میں اتنے شگاف پڑ جائیں گے کہ اب ان میں داخلے کے لیے سیاسی یا سماجی اجارہ داروں کے اجازت نامے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن سید احمد شمیم نے جدیدیت کی شعریات کو قبول نہ کرکے وفاداری بشرط استواری کو اصل ایمان قرار دیتے ہوئے بدلتی ہوئی ہوا سے منہ موڑ لیا۔ اس طرح اپنے کلام کی تازگی اور اپنے مزاج کی مفکرانہ انفرادیت کے باوجود سید احمد شمیم ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے لیے اجنبی ہی رہ گئے۔

ستمبر 1970 میں سید احمد شمیم نے شمس فریدی کے ساتھ مل کر نئی شاعری کا ایک انتخاب ”گلوب“ کے نام سے شائع کیا۔ ایک طرح سے یہ انتخاب ”نئے نام“، اور سید سجاد کے مرتب کردہ انتخاب ”نئی نظمیں“ کے جواب میں تھا۔ حسن اتفاق سے ”نئے نام“ اور ”نئی نظمیں“ دونوں کی اشاعت 1967 میں عمل میں آئی تھی، اول الذکر کی الٰہ آباد سے اور موخر الذکر کی لاہور سے۔ دونوں ہی انتخابات میں ایسی شاعری وافر تھی جسے ادب دوست لوگوں نے پسند کیا اور عام پڑھنے والے کو راحت اور فرحت کا احساس ہوا کہ ان کتابوں کے کسی بھی مصرعے، کسی بھی سطر میں شور، گھن گرج اور نعرہ نہ تھا، اور نہ ہی عمل اور انقلاب اور رجائیت کے بارے میں عمومی اور ”محفوظ“ (یا آج کی زبان میں ”سیاسی درستی کی حامل“) باتیں تھیں۔ لیکن ان کتابوں کو منفی ردعمل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کچھ تو انگور کھٹے ہیں والا ردعمل تھا، اور کچھ ردعمل واقعی سرگرانی اور پریشانی اور اس الجھن پر مبنی تھے کہ یہ کس طرح کی شاعری ہے؟ اسے سمجھنے کے طریقے کیا ہیں؟ اس کے مخاطب کون ہیں؟ سید احمد شمیم اور شمس فریدی نے ”گلوب“ میں ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش تو نہ کی لیکن اپنے دیباچے میں یہ ضرور لکھا: ”جدید شاعری میں کئی رنگ بیک وقت کارفرما ہیں، لہٰذا اس کی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں ہے۔“ یعنی وہ نئی شاعری کی اس تعریف کو رائج کرنے کے حق میں نہ تھے جس کا تقاضا جدیدت کی شعریات میں تھا، لیکن وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ جدید شاعری میں بوقلمونی ہے، اور ترقی پسند محاورہ شاعری کا واحد محاورہ نہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اس انتخاب میں ”کثیف اور بھدے رنگوں“ کی نمائندگی سے گریز کیا گیا ہے، لیکن ”ن م راشد سے لے کر وحید اختر تک کی بہترین نظمیں، جو 1960 سے لے کر اب تک لکھی گئی ہیں، منتخب ہو جائیں۔“ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ بہت بڑا دعویٰ تھا، اور اس کو عمل میں لانے کی کوئی بھی کوشش تمام پڑھنے والوں کو تو کیا، پڑھنے والوں کی بیش قرار تعداد کو بھی مطمئن نہ کر سکتی تھی۔ یہی سید احمد شمیم اور ”گلوب“ کا المیہ تھا۔

”گلوب“ میں ایک طرف تو ایسے شعرا تھے جو کسی ترقی پسند انتخاب میں بار نہ پا سکتے تھے، مثلاً بلراج کومل، جیلانی کامران، ساقی فاروقی، عادل منصوری، عباس اطہر، عمیق حنفی، فہمیدہ ریاض، اور محمد علوی، منیر نیازی وغیرہ، تو بہت سے ایسے شعرا تھے جدید نقاد جنھیں مسترد کرتے تھے، یا اگر مسترد نہ بھی کرتے ہوں تو انھیں ”اپنوں“ میں شمار کرنے سے قاصر تھے۔ (مثال کے طور پر فیض، مخدوم، منیب الرحمٰن، اور یوسف ظفر کے نام لیے جا سکتے ہیں۔) پھر یہاں کچھ ایسے بھی لوگ تھے جن کا تشخص نہ جدیدیت کے حوالے سے طے ہو سکتا تھا نہ ترقی پسندی کے حوالے سے، مثلاً حرمت الاکرام، ادیب سہیل، جمیل ملک، کرامت علی کرامت، عرش صدیقی، اور بہت سے دوسرے۔ اس طرح انفرادی مشمولات کی ممکن خوبی کے باوجود ”گلوب“ میں ایک گومگو کی سی کیفیت تھی اور اس نے معاصر شعر کے منظر میں سید احمد شمیم کے پیکر کو متاثر کیا۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی بات بڑی حد تک اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ سید احمد شمیم کا مقام و مرتبہ آج اکیسویں صدی میں کہاں اور کس طرح متعین کیا جائے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ان کے مجموعے ”بے در و دیوار“ کی ورق گردانی کریں تو بعض باتیں کچھ ان مل نظر آتی ہیں۔ اس مجموعے کا شاعر سماجی نابرابری اور سیاسی بے انصافی کے خلاف احتجاج کرتا ہے لیکن

اس احتجاج میں ایک تھکن ہے، بلکہ یوں کہیں کہ مایوسی ہے، کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا:

میں جانتا ہوں...
تو صرف یہ جانتا ہوں
کہ آنے والی صدی کا
بالمیکی
اپنی رامائن لکھے گا
تو یہ ضرور لکھے گا
کہ پچھلی صدی کے
لوگوں نے
رام کو مجبور کیا تھا
رام سر جھکائے
حیران کھڑے تھے
راون بھیانک قہقہے لگا رہا تھا...!! (دکھی دل لوگو)

ظاہر ہے کہ احتجاج میں تعمیم اس قدر ہے کہ اسے کسی بھی سیاق و سباق میں درست قرار دے سکتے ہیں، اور اس عمومیت کی بنا پر کلام میں نظم کی جگہ نثر کا انداز آگیا ہے۔ اس نظم کو سردار جعفری بمشکل قبول کرتے، کہ انھوں نے فیض کی نظم "صبح آزادی" کو اس کی عمومیت ہی کی بنا پر مسترد کیا تھا، لیکن اس نظم کو آج کے وہ نقاد بھی قبول کرتے ہوئے شرمائیں گے جو ادب میں ترقی پسندی کو کمیونزم کا مترادف قرار دیتے تھے اور آج اپنا موقف بدلتے بدلتے اس تقاضے تک آگئے ہیں کہ ادب میں کچھ نہ کچھ "نظریہ" ضرور ہونا چاہیے، بلکہ وہ تو ہوتا ہی ہے۔ اس نظم میں کسی نظریے کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے۔ دوسری طرف یہی سید احمد شمیم ایسی بھی نظم لکھتے ہیں جس میں ان کی آواز بالکل مختلف سنائی دیتی ہے:

ہوا تیز ہے
بادباں کو نہ کھولو
یہ کشتی یوں ہی تیز
چلتی رہی تو
چٹانوں سے ٹکرا کے
انجام کیا ہو
نہ میں جانتا ہوں
نہ تم جانتی ہو
ہوا تیز ہے
بادباں کو نہ کھولو (بادباں کو نہ کھولو)

یہ نظم جس ہستی سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہے وہ "مجلسی" یا "عوامی" دونوں ہی دنیاؤں کی مخلوق نہیں، وہ کسی داخلی یا خیالی عالم سے ہے۔ اس کو اپنے وجود کے لیے کسی "حقیقی" حوالے کی ضرورت نہیں۔ متکلم اور اس کے درمیان کا رشتہ استوار ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ ان کے درمیان یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ان باتوں سے زیادہ اہم ہے جو ہو سکتی تھیں لیکن نہیں ہوئیں، یا جنھیں ہونے سے روکنے کی سعی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ سعی کامیاب ہوگی کہ نہیں۔ ناکامیابی کی صورت میں جو روابط بنیں گے وہ شاید ٹوٹ بھی جائیں، لیکن کامیابی کی صورت میں وہ روابط اٹوٹ ہوں گے۔ اسی طرح ایک اور نظم میں روابط کی داستان ہم یوں سنتے ہیں:

اب انھیں چھوڑ کر
تم کہاں جاؤ گی؟
پھول
رنگ شفق
چاندنی
تن بدن میں سمائی ہوئی
گھر کی آسودگی
نرم بستر کی سب
بولتی سلوٹیں
تم جہاں بھی رہوگی
گدگدائیں گی
اب انھیں چھوڑ کر
تم کہاں جاؤ گی؟؟ (تم کہاں جاؤ گی؟)

یہاں خسرو کا شعر یاد آتا ہے۔

گفتی کہ برو، جاں ببرازمن، چہ روم چوں
ہر جا کہ روم بستہ بہ یک موے تو آیم

لیکن خسرو کے متکلم اور مخاطب دونوں ہی کو شاید ابھی ہوا کی تیزی کا اندازہ نہیں ہے۔ یا شاید بادبانوں کے کھل جانے کے بعد اب وہ کسی ایسی منزل پر ہیں جب آندھی تھم چکی ہے اور مطلوب کی روح کی ناؤ پر طالب کے بدن کا بوجھ بھاری ہو گیا ہے۔ خسرو کے شعر میں عشق کی مابعد الطبیعیات ہے۔ یہاں مطلوب اپنے طالب سے بہت بلند ہو گیا ہے لیکن مرتبۂ مطلوبی سے گرا نہیں ہے، بلکہ اب وہ وہاں ہے جہاں سے افتاد کا امکان ہی نہیں۔ سید احمد شمیم کی نظم میں گھریلو فضاؤں کی خوشبو ہے، لیکن اس خوشبو میں تلخی کا بھی شائبہ ہے۔ یہاں عشق کو روزمرہ زندگی کی طرح جینے کے معاملات ہیں۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ جس ہستی کو اس نظم میں مخاطب کیا گیا ہے وہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے اور متکلم اپنے دل میں یہ باتیں کہہ رہا ہے۔ یعنی یہ نظم تمنا بھری خود کلامی ہو سکتی ہے۔ لیکن نظم کے امکانات یہاں ختم نہیں ہوتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہستی گھر نہیں بلکہ دنیا ہی چھوڑ چکی ہو اور متکلم یا تو ہوش و حواس کھو چکا ہے یا خود کو بہلا رہا ہے۔

طالب و مطلوب کے روابط کے یہ گوشے جدیدیت میں نظر نہیں آتے، کیوں کہ جدیدیت کی شاعری بنیادی طور پر غیر عشقیہ شاعری ہے۔ لیکن یہ پیچیدگیاں اور نزاکتیں ترقی پسند شاعری کی بھی دسترس سے کوسوں دور ہیں۔

پتہ:
29-C, Hastings Road,
Allahabad, U.P.

انور محمود خالد

مشاہدات زنداں

(مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی)

''مشاہدات زنداں'' مولانا حسرت موہانی کی آپ بیتی ہے جو ''قید فرنگ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اردو کی خودنوشت مختصر سوانح عمریوں میں غالباً یہ سب سے زیادہ مقبول آپ بیتی ہے، کیونکہ اس میں اردو کے ایک مشہور شاعر، سیاست دان اور صحافی نے اپنی ایک سالہ اسیری کی روداد بیان کی ہے۔ اپنے رسالہ ماہنامہ ''اردوئے معلی'' کے شمارہ دسمبر 1909 میں اس آپ بیتی کی پہلی قسط شائع کرتے ہوئے مولانا حسرت موہانی نے اپنے نوٹ میں وضاحت کی کہ ''23 جون 1908 سے 19 جون 1909 تک، بزمانۂ قید فرنگ، جو کچھ راقم الحروف نے دیکھا یا سنا، اس کے شائع کرنے کا، بہ بوجوہ، چند در چند، ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہوکر اب یہ قصد کر لیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا عنوان کے کم از کم دلچسپ واقعات اور حالات ہر ماہ درج رسالہ ہوا کریں۔'' حسرت موہانی کی اسیری کی یہ داستان ''اردوئے معلی'' کے شمارہ جنوری 1910 تک مسلسل شائع ہوتی رہی اور یہ تیرہ قسطوں میں مکمل ہوئی۔

عتیق صدیقی نے اپنی کتاب ''حسرت موہانی: قید فرنگ میں'' جو انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے زیر اہتمام 1982 میں شائع ہوئی..... میں بتایا ہے کہ رسالہ اردوئے معلی میں ''مشاہدات زنداں'' کی اشاعت کے بعد اس کا ایک ایڈیشن غالباً 1918 میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا تھا لیکن وہ نسخہ انھیں دستیاب نہ ہوسکا، البتہ حسرت موہانی کے انتقال کے بعد نیاز فتح پوری نے اسے ماہنامہ ''نگار'' لکھنؤ کے شمارہ جون 1952 میں پھر شائع کیا اور وہیں سے اخذ کرکے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کراچی سے 1976 میں شائع ہونے والے اپنے ماہنامہ ''نگار'' کے حسرت نمبر میں چھاپا۔ عتیق صدیقی نے بھی اپنی کتاب ''حسرت موہانی: قید فرنگ میں'' میں ''مشاہدات زنداں'' کو اردوئے معلی کی تیرہ اشاعتوں سے نقل کرکے 56 صفحات میں سمیٹ لیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ مشاہدات زنداں..... حسرت کی پہلی ''جیل یاترا'' کے تجربات کی ہیبت ناک داستان ہے جو زبان و بیان کے اعتبار سے ادبی اہمیت کی اور مواد کے اعتبار سے تاریخی نوعیت کی ہے لیکن یہ افسوس ناک ہے کہ عالمی زندانی ادب میں یا کم از کم ہندوستانی زندانی ادب میں اسے وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کی وہ مستحق ہے۔ حسرت نے اپنی قید و بند کی زندگی کا ایک سال جس حال میں بسر کیا تھا اور اس کے دوران ان سے جو وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا، اس کو حسرت نے اگرچہ کچھ حد تک تفصیل کے ساتھ ''مشاہدات زنداں'' میں قلم بند کیا ہے لیکن ان کے انداز بیان کا یہ پہلو خصوصیت سے قابل توجہ ہے کہ اس میں کسی جگہ بھی بغض و عناد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔''

مولانا حسرت موہانی نے آغاز داستان میں خود بتایا ہے کہ انگریزی حکومت نے انھیں 23 جون 1908 کو اپنے رسالہ ''اردوئے معلی'' میں ایک مضمون شائع کرنے پر بغاوت کے جرم میں گرفتار کیا اور مقدمہ چلا کر دو سال قید با مشقت اور پچاس روپئے جرمانہ کی سزا سنائی۔ اپیل کرنے پر ان کی سزا ایک سال رہ گئی اور جرمانہ کی رقم ان کے بھائی نے ادا کر دی۔ گرفتاری کے وقت ان کی شیرخوار بیٹی نعیمہ بے حد علیل تھی اور گھر پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا، لیکن اس موقع پر ان کی اہلیہ نشاط النساء نے بے حد حوصلہ مندی، استقامت اور جرأت کا مظاہرہ کیا اور گرفتاری کے اگلے روز ہی سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے سے انھیں ایک خط لکھا جس میں حسرت موہانی کا یہ کہہ کر حوصلہ بڑھایا کہ:

''تم پر جو افتاد پڑی ہے، اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار، تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو۔''

مولانا حسرت موہانی نے ''مشاہدات زنداں'' میں جیل کی زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے قیدیوں پر ہونے والے مظالم اور ان کی بے بسی کی المناک تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''حوالات میں داخل ہونے پر گرفتاران زنداں کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالت زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمین جیل، ناجائز حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی وقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں ناکردہ گناہ پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ سنگ دلی کا یہ قابل نفرین برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت کافی، محض اس لیے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہو تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آبرو تو خاک میں مل جائے گی۔

خود حسرت موہانی کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ

''تقریباً چالیس روز کی کش مکش اور بیکار طوالت کے بعد آخر کار مقدمہ کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی 4 اگست 1908 سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جانگیا اور ایک کرتا، ٹوپی، پہننے کے لیے ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اوڑھنے کے لیے اور ایک قدح آہنی بڑا اور ایک چھوٹا، جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔ ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔''

قید کے پہلے روز سے ہی حسرت موہانی کو چکی کی مشقت کا سامنا کرنا پڑا جس کی طرف انھوں نے اپنے مشہور شعر میں یوں اشارہ کیا ہے:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

انھیں روزانہ ایک من گندم پیسنے کی اذیت ناک سزا دی گئی جو یوں تو ایک دو ماہ کے بعد ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن ایک سیاسی قیدی کو زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے کے لیے جیل کے حکام نے، بالائی اشارے پر پورے سال ان سے چکی کی مشقت کرائی۔ حسرت موہانی نے اُف تک نہ کی اور ہر روز صبح سے شام تک، حتیٰ کہ رمضان المبارک کے مہینے میں بھی وہ ایک من گندم جیل کی بھاری بھرکم چکی سے، اپنے ہاتھوں پیستے رہے، حالانکہ پڑھے لکھے قیدیوں سے نسبتاً ہلکی مشقت بھی لی جاتی تھی۔ مثلاً ان سے لکھنے پڑھنے کی کوئی خدمت لینا اس زمانے کا عام معمول تھا۔

مولانا حسرت موہانی نے جیل کے اندر، قیدیوں کو فراہم کیے جانے والے گھٹیا لباس، ان کی مضرِ صحت خوراک، ان کی تکلیف دہ جائے رہائش اور ان کے روزمرہ کے قابلِ رحم معمولات کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے جیل کی زندگی، جیتے جی، جہنم کا ایک نمونہ نظر آتی ہے۔ البتہ اس آپ بیتی کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے جس میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے جیل کے قیدی ساتھیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سیاسی زعما، اخلاقی مجرم، جیل کے نچلے اور بالائی عملے کے اراکین اور جیلوں کا معائنہ کرنے والے سرکاری حکام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں بے حد دلچسپ کردار بھی ہیں۔ جلاد صفت جیلر اور ڈپٹی جیلر بھی اور ہمدرد قیدی، سیاست دان اور معائنہ کرنے والے بعض اعلیٰ حکام بھی۔ علاوہ ازیں مولانا نے عام قیدیوں اور گورے یا یورشین قیدیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے دوہرے امتیازی سلوک کی روداد بھی بیان کی ہے اور عام ملکی قیدیوں کے ساتھ ناروا برتاؤ اور گوروں کو ہر قسم کی سہولیات بہم پہنچانے کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اردو کے زندانی ادب میں حسرت موہانی کی یہ خودنوشت سوانح عمری، مختصر ہونے کے باوجود، جیلوں کے بارے میں کھرے اور سچے مشاہدات پیش کرنے کی وجہ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔

(بہ شکریہ ''مخزن'' لاہور، جلد-6، شمارہ-12)

□□□

ڈیوڈ کاپرفیلڈ (جلد اوّل)

مصنف: چارلس ڈکنس/مترجم: فضلِ حسنین

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشاپردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔ اسے ترجمہ نہیں، اصل ناول کا عکسِ جمیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ڈیڑھ سو برس قبل انگریزی میں لکھے گئے اس شہرۂ آفاق ناول کا پہلی مرتبہ اردو ترجمہ پیش کرنے کا شرف ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کو حاصل ہے۔

صفحات: 516، قیمت-/256 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔ اداره

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

احتشام دیشمکھ

آئی. ایچ. ٹی. ایس. فار کینسر

مرکزی حکومت کے محکمۂ صحت کا ایک، اور اس کے ساتھ ہی مہاراشٹر صوبائی حکومت کے محکمۂ صحت کا ایک، ایسے دو لفافے ڈاکیے نے کھڑکی میں سے پھینکے جو سیدھے میری گود میں آ گرگرے۔ دیکھا تو دونوں پر میری بیگم نفیس کا نام درج تھا۔ سخت حیرت ہوئی کیونکہ ان کی خط و کتابت میری ہی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ ان کے میکے اگر خط لکھنا ہوتا تو وہ فرض بھی مجھے ہی انجام دینا پڑتا۔ پھر ان کے نام سے یہ دونوں لفافے؟......

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ بے چین ہو کر میں نے دونوں لفافوں کو چاک کیا۔ ان میں تحریر شدہ مضمون یوں تھا۔

محترمہ!

آپ کے داخل کردہ عریضے کے تحت آپ کو اطلاع دیتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے۔ حکومت کے محکمۂ صحت نے آپ کا انتخاب آئی۔ ایچ ٹی ایس فار کینسر (آئیڈیل ہیومن ٹیسٹنگ سیمپل فار کینسر) کے لیے کر لیا ہے۔ بھارت سرکار آپ کی ممنون و مشکور ہے۔ آپ نے بیرونی ممالک جانے کی بجائے بھارت میں ہی ڈاکٹروں کے لیے بطور sample رہنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ بھارت سرکار آپ کی شکر گزار ہے۔ آپ کی جانب سے پیش کردہ ہر شرط سرکار نے منظور کر لی۔ ان شرائط کے مطابق آپ کا لڑکا سمیر اور لڑکی صبا دونوں کے لیے بھارت کے کسی بھی میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کورس میں داخلے کے لیے جگہیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ ان کے تعلیمی اخراجات کی پوری ذمے داری بھارت سرکار نے اپنے ذمے لی ہے۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اگلے ماہ کی تیس تاریخ کو دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کی ملکیت کے رانی کھیت بنگلے میں صبح ٹھیک دس بجے ضرور حاضر رہیں۔ اس خط کے ساتھ ہی آپ کے روزمرّہ کے پروگراموں کی ہدایات منسلک ہیں۔

خط پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ساری دنیا مجھے گردش کرتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اپنی پیشانی پر دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کیے میں وہ ہدایات پڑھنے لگا۔

1- اب آپ بھارت سرکار کی ملکیت ہیں۔ آئندہ آپ کا اپنے خاندان اور رشتے داروں سے کوئی بھی تعلق نہیں رہے گا۔ آپ کو ان سے اور ان کو آپ سے کبھی بھی ملنے نہیں دیا جائے گا۔

2- آپ کی موت صیغۂ راز میں رکھی جائے گی۔ آپ کی لاش رشتے داروں کے حوالے نہیں کی جائے گی۔ اس تعلق سے میڈیکل کالج کا فیصلہ آخری فیصلہ تصور کیا جائے گا۔

3- انسٹی ٹیوٹ میں حاضری کے بعد شروعات کے ایک مہینے کی مدت تک آپ کو Under Observation رہنا ہوگا۔ دوسرے ماہ میں آپ کے جسم میں کینسر کے جراثیم داخل کیے جائیں گے۔ اس کے بعد تیسرے ماہ میں......

میری آنکھوں کے سامنے حروف دھندلانے لگے۔ دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا۔ نفیس اس حد تک گر جائے گی یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی میری ایک ذرا سی غلطی کی اتنی بھیانک سزا...... اور وہ بھی خود کو؟...... میں دکھ سے چیخ پڑا۔

''نہیں نفیس نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گی۔ میں تم کو کبھی جانے نہ دوں گا۔ پگلی...... نسرین کا بھی اس میں کیا قصور ہے؟ قصور ہوگا، گناہ ہوگا، تو وہ صرف میرا ہی ہے۔ تم اپنے آپ کو کیوں سزا دے رہی ہو؟

چار ماہ قبل کا واقعہ مجھے یاد آیا۔ ٹریننگ کے لیے بنگلور جانے کی مجھ کو ہدایات دی گئی تھیں۔ میں رات کی ٹرین سے روانہ ہوا۔ نفیس نے بھیگی پلکوں سے مجھے الوداع کہا۔ دل و دماغ پر بوجھ لیے میں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ ٹرین روانہ ہوئی۔ مسلسل ڈھائی مہینے کی ٹریننگ کے لیے میں جا رہا تھا اس لیے دل بہت اداس تھا۔

اگلے اسٹیشن پر ''کریو' بدلنے کے لیے ٹرین کو رکنا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور پلیٹ فارم پر اترا۔ دور سے نسرین آتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی تقریباً دوڑتے ہوئے میرے کمپارٹمنٹ کے قریب آئی ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اور ہاتھوں میں چائے کا تھرمس لیے ہوئے...... میں نے کہا:

''نسرین... ہاؤ ڈو یو نو....''

''ارے صاحب، پچھلے ہفتے آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مجھے جانا ہے لیکن میں سچ کہوں؟ پونہ میں سیمینار تھا اور جانا از حد ضروری تھا۔ پر جانے کو مطلق دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آج آپ جائیں گے۔ ڈھائی تین مہینے آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی...... آپ کو دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔ اور اپنے آپ پر کسی سہارے کا احساس ہوتا ہے۔

میں چکرا گیا۔ سوچنے لگا کہ آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہے؟ اس سے قبل تو کبھی اس طرح کی باتیں نہیں کی تھی۔ وہ کالج میں انگریزی کی پروفیسر تھی۔ خوبصورت... زبان میں مٹھاس ... ادب میں مہارت... تین سال قبل میرا اس سے تعارف ہوا تھا۔ بس یوں ہی ملاقات ہو گئی تھی...... اور اس کے بعد گھر آنا جانا شروع ہوا۔ اس کی کتابوں کے لیے میں نے کمپنی سے تعاون حاصل کروا دیا تھا۔ گھر جانے میں تاخیر ہو جانے پر کئی مرتبہ میں اس کو اپنے اسکوٹر پر اسٹیشن تک چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کئی مرتبہ غیر محسوس طریقے سے اپنے سر کو میرے کاندھوں پر رکھ

دیتی تھی۔ کبھی میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھوں کو رکھ دیتی۔ اس کے ہاتھوں کے لمس میں ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوتا تھا۔ دل چاہتا کہ یہ لمس مسلسل جاری رہے۔ لیکن میں نے کبھی بھی کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اظہار بھی کیوں کر کرسکتا؟ میں شادی شدہ تھا۔ خوبصورت بیوی......وہ معصوم بچے......ایسا ویسا کوئی خیال بھی میں اپنے دل میں نہیں لاسکتا تھا۔

نسرین مسلسل بولے جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وہ کچھ بے چین بھی نظر آرہی تھی۔ دھیرے سے میں نے کہا:

''نسرین، اب تو اپنی شادی کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کروگی؟ شادی کرہی ڈالو۔ خوش رہوگی۔''

میرے الفاظ سن کر اس کے چہرے پر ایک مایوس مسکراہٹ ابھری۔ بولی۔

''کس سے کروں میں شادی؟......کون مجھ سے شادی کرے گا؟......

ہمارے سماج کو بہت زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی قابل قبول ہوتی ہے کیا؟''

اچانک ہی سوالیہ نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ ان گنت سوال تھے اس کی اداس نگاہوں میں......وہ بولی۔ ''مسلمان خواتین کے تعلق سے آپ کی تحریروں میں خوب تڑپ ہوتی ہے نا؟......تو پھر کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ کیا آپ میں وہ حوصلہ ہے؟ آپ رکھیں گے اس حال میں میں رہوں گی۔ ......عورتوں کے مسائل پر بولنا اور لکھنا تو بہت آسان ہوتا ہے صاحب۔''

بولتے بولتے اس کی پلکوں کے کناروں پر نمی آگئی......میری حالت بھی غیر ہوگئی۔ یہ تو میری مردانگی کو ہی چیلنج دیا گیا تھا۔ میں حیرت زدہ نظروں سے اسے تاکے جارہا تھا۔ اچانک ٹرین پٹریوں پر رینگنے لگی۔ جذبات سے مغلوب ہوکر میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلا سوچے سمجھے اس کے دونوں کاندھوں پر رکھ دیے۔ وہ چونک پڑی۔......اور اس کی پرنم آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔...ٹرین آگے روانہ ہونے لگی۔

ٹرین تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی پر میرا ذہن تین سال قبل ماضی میں کھوگیا تھا۔

مجھے ہماری پہلی ملاقات یاد آئی۔ وہ کسی پروگرام کا دعوت نامہ لے کر آئی تھی۔...تعارف ہوا اور اس کے بعد بس......گھر پر آنا جانا شروع ہوگیا۔ گھر کے سبھی افراد کو اس میں کشش سی محسوس ہوئی۔ وہ بولتی تو بس بولتی ہی جاتی۔..قہقہہ مار کر ہنستی...اور اس کی ہنسی تو بڑی ہی دلکش تھی...کبھی کبھی کسی سنگین مسئلے پر خوب جذباتی ہوجاتی۔ غصے میں بھر جاتی۔ سماج اور سماج میں بسنے والے ڈھونگی انسان اور اسی طرح معاشرے میں رہنے بسنے والی تعلیم یافتہ اور قابل خواتین کے سلگتے مسائل پر وہ چراغ پا ہوجاتی۔

دو تین مرتبہ میں نے دھیرے سے اس کی شادی کا تذکرہ کیا تو اس نے یہ ذمے داری مجھ پر ہی سونپ دی اور بولی۔

'کیوں کرتے ہیں صاحب! آپ ہی میرے لیے قابل بر تلاش کردیں۔ آپ کی پسند کو میں نا نہیں کروں گی۔''

اور پھر اس کے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے میں نے اپنے دوستوں کو اس کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرنے کی درخواست کردی۔ دوستوں نے دو تین رشتے بتلائے بھی۔ جن میں ایک رنڈوے خانصاحب، عمر پچاس سال۔ دوسرے ایک صاحب جن کی شریک حیات زندہ تھی پر وہ نکاح ثانی کے خواہش مند تھے، صرف اولاد حاصل کرنے کے لیے۔ تیسرا رشتہ بھی بس یوں ہی سا تھا۔ میں کس منہ سے اسے ان رشتوں کے لیے کہتا؟ اس کا حسن، اس کی گفتار، اس کے عادات و اطوار، اس کے دل کی پاکیزگی یہ سارے اوصاف اس کے لیے سودمند ثابت نہیں ہورہے تھے اور اس پر مزید زیادتی اس کی قابلیت اور اس کی تعلیمی ڈگریوں کی تھی۔

ایک سال بیت گیا۔ ابھی تک کہیں بھی رشتہ طے نہیں ہو پایا تھا۔ اچانک ایک مرتبہ پھر اس کے رشتے کی بات چلی تو وہ بکھر گئی اور بولی

''بہت ہوگیا صاحب! آپ، آپ کا سماج، آپ کے رہنما، نان ونفقہ کے مسائل، ذات پات مذہب کے مسائل اور مسلم سماج کے مسائل حل کرتے رہیں۔ میں بھی ایک زندہ انسان ہوں۔ میرے سینے میں بھی دل ہے۔ میرے بھی جذبات ہیں۔ میرا بھی ایک جسم ہے اور میری بھی جسمانی خواہشیں ہیں۔ ان سے دوں کو میں کب تک دبائے رکھوں گی؟ اگر کبھی میرے پیر پھسل جائیں تو برائے مہربانی آپ مجھے قصوروار تصور نہ کریں......''

اس کا یہ روپ دیکھ کر میں لاجواب ہوگیا تھا۔

اور آج......آج اس کے یہ سوالیہ الفاظ......پھر میرے کانوں میں گونجنے لگے......''آپ کریں گے مجھ سے شادی؟......کریں گے مجھ کو قبول؟''

میں نے دل میں سوچا۔ اگر میں نے سچ مچ اس کو قبول کرلیا تو؟ رہ رہ کر یہ خیال دل میں گھر کرتا گیا۔ نسرین سگھڑ لڑکی ہے۔ نہایت ہی قابل اور بے عیب ہے۔ جذبات سے مغلوب ہوکر گمراہ ہوگئی تو؟ اکتا کر خودکشی کرلے تو؟......اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ سماج کے ٹھیکے دار اپنے خیالات کو کاغذ کی زینت بناتے رہتے ہیں۔ یہ کسی کی زندگی کیوں نہیں سنوارتے؟ میرا شمار سماج کے سنجیدہ افراد میں ہوتا ہے۔ پھر میں ہی کیوں نہ اس کو اپنالوں؟ سماج میں تعلیم یافتہ، مہذب اور قابل لڑکیوں کی روشن صبحیں نا جانے کب اندھیری راتوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔ اس کا انھیں احساس بھی نہیں ہوتا اور پھر ان سیاہ راتوں میں وہ گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں اپنے جذبات کی آگ ٹھنڈی کرلیتی ہیں۔ اگر معاشرے میں یہی سب کچھ جاری رہا تو ہمارا یہ سماج تعلیم یافتہ طوائفوں کی منڈی بن جائے گا۔ مذہب اگر اجازت دے رہا ہے تو قابل اور شادی شدہ مرد غرض مند، بے سہارا اور عمر رسیدہ خواتین سے نکاح کیوں نہ کرلیں؟ زندگی کا چراغ گل ہوتے وقت کم از کم سماج میں عزت کا مقام حاصل کرکے سکون قلب کے ساتھ تو وہ مرسکیں گی......

ٹرین نے پٹری بدلی۔ جس کی کھڑکھڑاہٹ سے میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ اور جب میں چونکا تو میرے دل نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔ صبح ٹریننگ کی

جگہ پہنچا اور ایک کاغذ پر چند سطریں لکھ کر ڈاک کے حوالے کردیں۔

عزیز از جان نسرین

میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ میں بھی تمھاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ کیا میری محبت قبول کروگی؟

صرف تمھارا

اشفاق

چار دنوں کے بعد اس کا خط ملا۔

صاحب!

سلام......

آپ کا خط ملا۔ انجانی راہوں پر میرا اور آپ کا سفر نہ جانے کتنے دنوں سے جاری تھا۔ کس کی زبان میں دو چار مرتبہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ پر آپ خاموش رہے۔ دل میں چاہت ہونے کے باوجود بھی اس کا اظہار نہیں کیا۔ تو پھر کیوں نہ میں؟ میرے اندر کی "میں" آخر آپ تک پہنچ ہی گئی۔ صاحب! محبت کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ زبانی اظہار کا نام محبت نہیں ہے۔ آپ کی آواز میرے دل کے نہاں خانے تک کب کی پہنچ چکی تھی۔ پر آپ کی اس آواز کو میں کون سے رشتے کا نام دوں؟"

جواب کی منتظر

یہاں پر کیا لکھوں؟

نسرین

اس خط کے جواب میں میں نے لکھا۔ "جو رشتہ چاہے مجھ سے طلب کرلو۔ تم جس رشتے کی بھی تمنا کروگی وہ میں تم کو دینے کے لیے بسروچشم تیار ہوں۔"

اس کا خط آیا۔ دل کے تمام شک وشبہات دور ہوگئے تھے۔ رشتہ طے ہوچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے خیالات ڈانواڈول ہورہے ہیں۔ اس نے لکھا تھا۔

صاحب!

حالات سے مجبور سخت دھوپ میں بھٹکتا ہوا ایک مسافر۔ دنیا کا سفر کرنے نکلا تھکا ہارا وہ ایک باغ میں پہنچا۔ باغ میں دکھائی دی اس کو ایک بیل۔ جوہی کے پھولوں کی۔ نازک، شرمیلی، ہاتھ لگاتے ہی مسلی جانے والی۔ اس کی من موہنی خوشبو سے مسافر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ اس نے وہیں قیام کردیا۔ بیل نے اس کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دونوں بہت ہی خوش تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی صحبت نصیب ہوگئی۔

لیکن مسافر کی دنیا الگ تھی۔ بیل کا جہاں اور تھا۔ بیل وہیں رہنے والی تھی۔ سدا کے لیے۔ لیکن مسافر کو آگے جانا تھا۔ بیل اسے روک نہیں سکتی تھی۔ مسافر کی جدائی کے تصور سے ہی وہ تھرا اٹھی۔ گھبرائی اور مسافر کو مضبوطی سے لپٹ گئی۔ پاگل مسافر۔ اس کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ بیل کو اس طرح تنہا چھوڑ کر جانا مسافر کو گویا اپنے تن سے روح نکل جانے کے مترادف تھا۔ پر جانا تو ضرور تھا......

صاحب! کیا مسافر بیل کو چھوڑ کر چلا جائے؟ اگر چھوڑ کر چلا ہی جائے تو مستقبل میں اس بیل کا کیا ہوگا؟...... اس ادھورے افسانے کو آپ کو ہی پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ افسانے کا انجام آپ کے ہاتھوں اور آپ کی مرضی کے مطابق ہونا ہے۔

اور اس افسانے کا انجام میں نے طے کرلیا۔ خط کے ذریعے اس انجام کو آگاہ کرنے کی بجائے عملی طور پر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا میں نے فیصلہ کرلیا۔ ویسے دیکھا جائے تو میری حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ تو شاید اللہ کی ہی مرضی تھی۔ ٹریننگ ختم ہوتے ہی میں فوراً نسرین کے پاس پہنچا اور اس کو ساتھ لے کر اپنے ایک دوست کے یہاں گیا اور اسی رات میں اور نسرین نکاح کے بندھن میں بندھ گئے۔ نسرین اور میں ایک ہوگئے۔ اتنی ہمت میں اپنے آپ میں کس طرح مجتمع کرسکا؟ یہ سوچ کر ہی میں حیرت زدہ ہوجاتا تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ اپنی اس حرکت سے میں ذرا بھی گھبرایا اور نہ ہی بے چین ہوا تھا۔ "تم نے کوئی بھی غلطی نہیں کی اور نہ ہی اپنے بیوی بچوں سے کوئی ناانصافی کی ہے۔ تم ان کے ساتھ انصاف ہی کروگے۔ تم میں اتنی قوت ہے۔ تم نے تو ایک بے سہارا اور بے بیاہی خاتون کو سہارا دیا ہے......" میرے اندر بسے ہوئے "میں" کو میں نے فنا ہونے نہیں دیا۔

نسرین کو اس کے گھر پہنچایا۔ اپنے گھر آنے پر نفیس کو تمام حقیقت سے آگاہ کردیا۔ یہ سنتے ہی وہ غصے سے بے قابو ہوگئی۔ کہنے لگی "آپ کو ہم دونوں میں سے کسی ایک کا ہی انتخاب کرنا ہوگا۔"

لیکن...... میں تو دونوں کو ہی چاہتا تھا۔ اور دونوں کی مجھے ضرورت تھی......
نفیس اور نسرین دونوں کی ہی...... میں نے اس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ زندگی کے کسی بھی موڑ پر نسرین تم پر حاوی نہیں ہو پائے گی۔ تمہارے حقوق اور تمہاری محبت صرف تم کو ہی ملتی رہے گی۔ قسمیں بھی کھائی۔ وعدے بھی کیے۔ پر نفیس کسی بھی حال میں سننے کو تیار نہیں ہوئی۔ وہ بار بار صرف ایک ہی سوال کرتی رہی۔ "آپ نے یہ کیوں کیا؟ مجھ میں کیا کمی تھی؟" میں اس کو کیا جواب دیتا؟ میرا کوئی بھی جواب اس کو مطمئن نہیں کرسکتا تھا۔ بالآخر مجھے خاموش ہوجانا پڑا۔

دن گزرتے گئے نسرین کبھی کبھار گھر بھی آجاتی تھی۔ میں ہی اس کے گھر جاتا رہتا۔ نفیس نے اب شکایتیں کرنی ترک کردی تھی۔ اور مکمل طور سے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اب پوری طرح پرسکون ہوگئی ہے۔

لیکن آج...... آج اچانک یہ دونوں لفافے میرے ہاتھ لگے۔ ساری حقیقت آشکارا ہوگئی...... میرا دل چیخ رہا تھا۔ میں تو صرف ایک ہی ہستی کا بھلا کرنے نکلا تھا۔ لیکن نفیس...... وہ تو تمام انسانیت کی فلاح کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ وہ ایک عظیم شخصیت ثابت ہوئی تھی اور میں؟ اس کے مقابل ایک خاک آلود بندۂ حقیر۔

مراٹھی سے ترجمہ: محمود شیخ

پتہ:
47, (A) Ashiyana Colony,
Dhulia - 424001 (M.S.)

اقتدار عالم خاں

اردو زبان اور 1857 کی بغاوت

1857 کی بغاوت بنیادی طور پر نوآبادیاتی حکمرانوں کے استبداد، تہذیبی جارحیت اور معاشی استحصال کے خلاف عام ہندوستانیوں کی بے چینی کا نتیجہ تھی جس میں بنگال آرمی کے باغیوں نے تقریباً ایک ہراول دستہ کا رول ادا کیا تھا۔ شاید بغاوت کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ باغیوں کے جوش اور جنگ جویانہ ولولہ کی کسی ایک سیاسی اور نظریاتی سمت میں پیش رفت ممکن نہ ہوسکی۔ ایسی پیش رفت تب ہی ممکن تھی جب وہ تہذیبی نشاۃ ثانیہ، جس کے امکانات مغربی علوم اور فکری عوامل کے نتیجے میں، اس زمانے کے بنگلہ کلچر میں نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے، ملک کے ان حصوں کو بھی متاثر کر چکا ہوتا جہاں بغاوت کے مراکز مثلاً دہلی، لکھنؤ، جھانسی وغیرہ واقع تھے۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں جو مذہبی اور تہذیبی تحریکیں ہندی علاقوں میں ابھریں ان میں 1857 کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن ان تحریکوں کو ''1857 کا نشاۃ ثانیہ'' قرار دینا شاید پوری طرح صحیح نہیں ہوگا۔ یہ یقیناً بحث طلب مسئلہ ہے کہ ایک سماجی اور سیاسی انقلاب کی ناکام کوشش کے بعد پیدا ہونے والے نئے تہذیبی رجحانات کو کس طرح اس واقعہ کا نشاۃ ثانیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہرصورت یہ ایک متنازعہ فیہ سوال ہے جس سے، فی الوقت پہلو تہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

زیر بحث موضوع کے سیاق میں یہ جاننا ضروری ہے کہ 1857 کے باغیوں نے جس زبان یا جن زبانوں میں اپنے پیغام کو عوام کے وسیع تر حلقوں تک پہنچانے کی کوشش کی وہ زبان یا زبانیں کون سی تھیں؟ اور یہ بھی کہ اس واقعہ کا شمالی ہند کی لسانی صورت حال پر کیا اثر مرتب ہوا؟ کیوں کہ یہ سوالات 1857 میں اردو کے رول کا بھی احاطہ کرتے ہیں اس لیے میری اس گفتگو میں ان پر کسی قدر توجہ، چاہے وہ کتنی ہی اجمالی کیوں نہ ہو، لازمی بن جاتی ہے۔

جہاں تک اردو کا تعلق ہے، 1857 کے باغیوں نے اپنے نعروں اور خیالات کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اس کا دو مختلف سطحوں پر استعمال کیا۔ ایک طرف باغیوں کے ہمدرد اور ہمنوا اردو شاعروں اور ادیبوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے (جن میں خود بہادر شاہ ظفر سب سے زیادہ اہم حیثیت رکھتے تھے) اپنی شاعری اور صحافتی نگارشات کے ذریعے باغیانہ مسلک کی اشاعت کے کام کو نہایت پراثر طریقے سے انجام دیا۔ وہیں دوسری طرف باغیوں کو بہت جلد یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کی کامیابی کی امید تب ہی کی جاسکتی تھی جب کہ شمالی ہند کی شہری آبادی کی اکثریت، ہندو اور مسلم فرقہ بندی کی حدود سے اوپر اٹھ کر، نوآبادیاتی حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ ہوجائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مختلف جگہوں پر ایسی تحریریں، اشتہاروں اور پمفلٹوں کی صورت میں شائع کرنی شروع کیں جن میں سے بعض بیک وقت دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھیں۔ ان تحریروں کو ڈاکٹر اقبال حسین نے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کے لیے یکجا کیا ہے۔ ایسی تحریروں پر ایک سرسری نظر ہی یہ واضح کردیتی ہے کہ ان کی زبان عام بول چال سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات، کسی حد تک، فارسی آمیز بھی ہے۔ یعنی اس طرز کی اردو سے زیادہ مختلف نہیں ہے جس کی بابت ''ہاؤس ڈیوائیڈڈ'' کے مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک مصنوعی اور بیرونی عناصر کی حامل زبان بننے کی طرف اس وقت سے مائل رہی ہے، جب مغل زوال کے عہد، یعنی اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں، اس پر عمداً فارسی کا ٹھپہ گہرا کردیا گیا تھا۔ ان کا شاید یہ بھی خیال ہے کہ اردو زبان کا ایسی شکل اختیار کرنا ایک تہذیبی نفاق کی ابتدا ثابت ہوا جو بالآخر ملک کی تقسیم کا سبب بنا لیکن اپنے پروپیگنڈہ کے لیے باغیوں کا اس زبان کو استعمال کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ 1857 تک فارسی آمیز اردو کو شمالی ہند کے ایک وسیع علاقہ میں عام ترسیل کی زبان تصور کیا جاتا تھا۔ یہ خیال کہ ایسی زبان صرف شہروں کے رہنے والے مغل اشراف اور ان کے لواحقین ہی سمجھ سکتے تھے ایک ایسا لسانی تعصب ہے جو شاید انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوا۔ اس تعصب کے پیچھے جو عوامل کارفرما تھے ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہرکیف 1857 کے باغی، جن کے ہراول دستہ، یعنی بنگال آرمی کے باغی سپاہیوں کی اکثریت، جو اونچی ذات کے ہندوؤں پر مشتمل تھی، کسی بھی ایسے تعصب سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے اسی فارسی آمیز اردو کو ہندو مسلمان عوام کے درمیان ایک وسیع تر اتحاد قائم کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی جس کو بدقسمتی سے ہمارے بیسویں صدی کے بعض ''روشن خیال'' دانشور قومی نفاق کی علامت قرار دیتے ہیں۔

اردو لٹریری تحریروں میں کس طرح باغیوں کے مسلک کی نہ صرف حمایت کی گئی بلکہ اس کو مزید تقویت عطا کرنے کے لیے نئے، بعض اوقات نہایت طبع زاد نظری دلائل بھی پیش کیے گئے، اس کی ایک بہت اچھی مثال ''دہلی اردو اخبار'' کے اڈیٹر مولوی محمد باقر کی صحافتی تحریریں ہیں۔ ان میں سے ایک پایہ کی تحریر وہ ہے جو ''فرصت کو غنیمت سمجھنا چاہیے'' کے عنوان سے 21 جون 1857 کے ''دہلی اردو اخبار'' میں شائع ہوئی جس کا مرکزی استدلال یہ ہے کہ انگریز حکمراں مختلف طریقوں سے ہندوستان میں ''زر و مال'' جمع کرتے ہیں لیکن اس سرمایہ کو یہاں صَرف نہ کرکے ولایت لے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ہر سال ہندوستان کی دولت کا ایک بڑا حصہ باہر چلا جاتا ہے۔ اس طرح محمد باقر نے 1857 میں ہی اس عمل کی نشان دہی کردی تھی جس کو ہندوستانی قوم پرستوں کی

نگارشات میں، ڈرین آف ویلتھ کا نام دے کر، نوآبادیاتی نظام کی بنیادی بے انصافی کو اجاگر کرنے کے لیے اب تک استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری میں ''حب وطن'' کے جذبے کا زیادہ واضح اظہار پہلی بار 1857 کی بغاوت کے پس منظر میں ہی سامنے آتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جس میں شاید سب سے زیادہ پر اثر وہ ہیں جو بہادر شاہ ظفر کے کلام میں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1958 میں ''نوائے ظفر'' کے عنوان سے ان کے کلام کا ایک مستند انتخاب شائع کر کے 1857 کی بغاوت پر مہیا مواد میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ''نوائے ظفر'' کے اس حصے میں، جو 1857 اور اس کے بعد کی تخلیقات پر مشتمل ہے، ظفر کا ہندی کلام بھی شامل کیا ہے۔ اس حصے میں ایک ہندی بھجن ہے جس میں نہایت غمگین لہجے میں اس وقت کے ہندوستان کو ایک ایسی ''پھلواری'' سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کے پھولوں کی بو باس مر چکی ہے۔ ایک دوسری نظم میں جس کا عنوان ''ہولی'' ہے وہ ہندوستان کو ایک ایسی پھولوں کی کیاری قرار دیتے ہیں جو اجڑ چکی ہے۔ اسی دور کی اپنی غزل کے ایک شعر میں ظفر نے ''اقلیم ہند'' کے مستقبل کا ذکر کیا ہے جو ان کے وجدان کے مطابق تمام تر تباہی کے باوجود تا ابد موجود رہے گا۔ ایک اور جگہ اپنے ایک مشہور شعر میں، وہ المناک غمگینی سے پر لہجہ میں ہندوستان کو ''کوئے یار'' کے نام سے یاد کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں ''وطن دوستی'' کے جذبے کا ایسا واضح اظہار جو 1857 کی بغاوت کے زمانے سے شروع ہوا تھا آہستہ آہستہ اس کے لٹریری مزاج کا ایک ضروری جز بنتا چلا گیا جس کا ہم اس گفتگو کے آخر میں پھر ذکر کریں گے۔

دراصل اردو شاعروں کی 1857 کی بغاوت میں شمولیت اور اس کی بابت ان کی تخلیقات کا ذکر اپنے آپ میں ایک علاحدہ موضوع ہے جس پر طویل مقالہ لکھا جاسکتا ہے۔ اس گفتگو میں صرف چند اہم شعرا کے سرسری ذکر پر ہی اکتفا کیا جائے گا تاکہ واضح ہو سکے اس پہلی جنگ آزادی میں اردو زبان کو (جسے بعض لوگوں نے بیرونی کلچرل اثرات کا حامل قرار دے کر قومی زندگی کی لکھ دھارا کے باہر تصور کیا ہے) کیا مقام حاصل تھا۔ اس سلسلے میں لامحالہ پھر بہادر شاہ ظفر کا ذکر آئے گا کیوں کہ ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ نوآبادیاتی حکمرانوں نے 1862 میں پہلی بار جس شعری تخلیق کو باغیانہ قرار دے کر اس پر پابندی عائد کرنے کی ایما ظاہر کی تھی وہ ان ہی کو منسوب کی جاتی ہے۔ مزید برآں ایک چشم دید شہادت کے مطابق جس طرح انھیں لال قلعہ میں نظر بندی کے دوران دیواروں پر کوئلہ سے اپنے اشعار درج کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا، اس سے ان کا ایک بہت ہیرویک پکچر سامنے آتا ہے جس کو یاد رکھا جانا آزادی کی تحریک میں اردو شاعروں کے رول کو اجاگر کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں اور ذکاء اللہ کے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت کے بارے میں بعض وہ مندرجات جن میں ان کو ایک حواس باختہ اور عقل سے معذور انسان ثابت کرنے کی کوشش ہے، نہایت افسوس ناک ہیں جن کو ان حضرات کے درپیش مصلحتوں کے حوالے سے درگزر کرنا شاید مشکل ہوگا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر، اسد اللہ خاں غالب بھی (چاہے انھوں نے انگریزوں کی فتح کے بعد اپنی صفائی میں کچھ بھی لکھا ہو) بہادر شاہ ظفر کے دربار سے اس دور میں منسلک رہے جب بادشاہ نے باغیوں کی قیادت کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ اس دوران انھوں نے بہادر شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو اگر کبھی مل سکا تو ایک اہم تاریخی دستاویز قرار دیا جائے گا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی تمام تر احتیاط اور عنایتوں کے باوجود، دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد غالب کو ایک فوجی عدالت کے سامنے پیش ہونے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ اس وقت زیادہ امکان یہی تھا کہ چند سوالوں کے بعد انھیں، دوسرے مغل اشراف کی طرح، فوری طور پر پھانسی دے دی جاتی۔ یہ ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک خوش آئند معجزہ تھا کہ غالب کی حاضر جوابی کے تاثر سے نوعی عدالت کے سربراہ، کرنل برن کے سر سے خون ریزی کا وہ جنون، جو اس وقت اکثر انگریز افسروں پر طاری تھا، چند لمحوں کے لیے اتر گیا اور اردو کا عظیم ترین شاعر بغیر کسی سنوائی یا مقدمہ کے پھانسی پر چڑھائے جانے سے بچ گیا لیکن بعض دوسرے اردو شاعر اور ادیب اتنے خوش نصیب ثابت نہیں ہوئے۔ محمد باقر اور صہبائی، جن دونوں کا دہلی کالج سے ان کے دیرینہ تعلق کی بنا پر، روشن خیال لوگوں میں شمار ہوتا تھا، بغیر کسی سنوائی کے اس طرح مارے گئے کہ ان کی نعشیں بھی تدفین کے لیے نہ مل سکیں۔ محمد باقر کے بیٹے محمد حسین آزاد نے دور سے اپنے والد کو موت کے غار میں اترتے دیکھا تھا جس کا ان پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد اپنی کسی تحریر میں انھوں نے یہ قبول نہیں کیا کہ وہ محمد باقر اڈیٹر ''دہلی اردو اخبار'' کے بیٹے تھے۔ اسی طرح شکوہ آباد، بریلی بدایوں اور دوسرے مضافاتی شہروں کے اردو شعرا کی روداد بھی بہت دردناک ہے جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

1857 کی بغاوت کے تجربے نے اردو ادب کے بنیادی مزاج پر ایک دیرپا اثر چھوڑا تھا۔ اس کے بعد کی دہائیوں میں پیدا ہونے والے اردو ادب میں انسان دوستی اور وطن دوستی کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس رجحان کو آزادی کی تحریک کے مختلف ادوار میں برابر تقویت ملتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں، جب اردو بولنے والے مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست سے متاثر تھی، کسی بھی قابل ذکر اردو ادیب نے پاکستان کے نعرے کی حمایت میں کچھ نہیں لکھا۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے 1947 میں پاکستان کے پہلے یوم آزادی کے موقع پر نئی مملکت کے قومی گیت کا انتخاب، ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ □□□

پتہ:
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002 (U.P.)

فضل الرزاق خاں ارشد

جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں

1857 کی بغاوت کا آغاز میرٹھ سے ضرور ہوا لیکن یہ محض میرٹھ کے فوجیوں کی بغاوت نہیں تھی، ایک قومی بغاوت تھی جس میں خواص اور عوام دونوں شریک تھے۔ ریاست ٹونک راجستھان کی ایک نومولود ریاست تھی جو 1817 میں ایک بہادر پٹھان امیر خاں اور انگریزوں کے درمیان مفاہمت کے نتیجے میں قائم ہوئی۔ امیر خان نے یہ مفاہمت تب کی جب شمالی ہند اور وسطی ہند کے سبھی راجا اور نواب انگریزوں کے سامنے سپر انداز ہو گئے۔ 1857 کی بغاوت سے پہلے امیر خاں صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے بیٹے وزیر الدولہ ان کی جگہ مسند نشیں ہو چکے تھے جنھوں نے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دینے ہی میں عافیت سمجھی۔ لیکن ریاست میں ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے اس قومی جہاد میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ انھی میں ایک نمایاں شخصیت میر عالم خاں صاحب کی تھی جو نواب وزیرالدولہ کے حقیقی ماموں تھے۔ مادھیمک شکشا بورڈ راجستھان نے بارھویں جماعت کی درسی کتاب "بھارت کا آدھونک اتہاس" 1992 میں شائع کی تھی جس کے مرتبین ہیں ڈاکٹر آر این چودھری اور شری گووردھن لال پروہت، اور ایڈیٹر ہیں ڈاکٹر بی این شرما۔ کتاب کے صفحہ 235 پر ریاست ٹونک سے متعلق مندرجہ ذیل تفصیلات دی گئی ہیں:

"ٹونک کا نواب وزیرخاں، 1857 کے غدر کے وقت انگریزوں کے ساتھ تھا لیکن اس کی فوج کا بڑا حصہ باغیوں کا ہم نوا بن گیا۔ نواب کے ماموں میر عالم خاں باغیوں کے ساتھ تھے۔ نواب کے فوجیوں نے میر عالم خاں کی حویلی کا محاصرہ کر لیا۔ اس لڑائی میں امیر عالم خاں مارا گیا۔ اس کی جاگیر (چورو) ضبط کر لی گئی لیکن ٹونک کے 600 فوجی دلی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1857 میں تانتیا ٹوپے (اور) باندہ کے نواب جب ٹونک پہنچے تب ٹونک کے ایک معزز ناصر محمد خاں نے تانتیا کا ساتھ دیا۔ بناس ندی کے کنارے اور قلعۂ امیر گڑھ کے پاس باغیوں اور نواب کی افواج میں شدید لڑائی ہوئی۔ نواب نے اپنے آپ کو قلعے میں محصور کر لیا۔ باغیوں نے نواب کے دیوان فیض اللہ خاں کو گرفتار کر کے توپ خانے پر قبضہ کر لیا اور شہر کو لوٹ کر ریاست ٹونک پر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا، یہ حکمرانی لگ بھگ چھ ماہ تک رہی۔ بالآخر جے پور کے ریزیڈنٹ ایڈن جب بڑی فوج کے ہمراہ وہاں پہنچے تب ٹونک (باغیوں سے) آزاد کرایا جاسکا اور باغی ناتھ دوار چلے گئے۔"

ان واقعات کو کسی قدر تبدیلی کے ساتھ "تاریخ ٹونک" میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "اسی سال (1273ھ بمطابق 1857) صاحبزادہ میر عالم خاں صاحب خلف اکبر جناب ممتاز الدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں بہادر استقامت جنگ، خسر حضرت نواب امیر الدولہ بہادر، بوجہ سرکشی باغیانِ تمرد توامان، فوج ریاست کے ہنگامہ آرائی میں مقتول ہوئے اور اسی ہنگامے میں صاحبزادہ صاحب مقتول کے ہاتھ سے بیان خاں رسالہ دار کشتہ ہوئے اور انھیں دنوں میں صاحبزادہ عظیم اللہ خاں عرف بنے میاں، برادر خورد صاحبزادہ صاحب مقتول نے، مقید جیل ریاست ہو کر بحالت مقیدی انتقال کیا۔" (تاریخ ٹونک از اصغر علی آبرو، مقالہ دوم، مطبوعہ ستارۂ ہند پریس آگرہ، سال اشاعت 1319ھ 1901 ص-44)

تفصیل عظیم اللہ خاں مرحوم کی بابت یہ ہے کہ اس معرکہ آرائی کے وقت موصوف ٹونک میں موجود نہیں تھے اور اپنی جاگیر پچپلانہ گئے ہوئے تھے۔ میر عالم خاں کی شہادت کے بعد نواب کے کارندے عظیم اللہ خاں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ ٹونک لا کر انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ نظر بندی کے بعد جب انھیں اپنے بڑے بھائی میر عالم خاں کی شہادت کا علم ہوا تو دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کے افسوس کرتے تھے کہ میں اس وقت کیوں موجود نہیں تھا۔ انھوں نے اس اطلاع کے بعد رزق کو ہاتھ نہیں لگایا اور کئی دن فاقے کے عالم میں گزار کر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

اصغر علی آبرو اپنے مقالے میں آگے تحریر کرتے ہیں: "بتاریخ بست و چہارم ماہ ذی الحجہ یوم سہ شنبہ 1274ھ (مطابق 1857) مفسدان گوالیار نے کہ تخمیناً بیس ہزار سوار اور پیادے تھے، نگراج علاقہ ٹونک میں قیام کیا، بتاریخ بست و ششم ماہ مذکور روز پنجشنبہ مفسدان خسارت منش نے اپنے لشکر کے تین حصے کر کے تین جانب سے ٹونک پر یورش کی۔ وقت عصر سے غروب آفتاب تک بازار کارزار گرم رہا بعدہٗ بتاریخ بست و ہفتم مفسدین خبر آمد لشکر انگریزی سن کر بوقت نصف النہار فرار ہو گئے۔" (تاریخ ٹونک/ مقالہ دوم۔ ص-44) ہنومان سنگھل نے اپنی کتاب "تاریخ ریاست ٹونک" میں کمڑ گادت ناتھ کی کتاب "رول آف راجستھان ان دی اسٹرگل آف 1857" کے صفحہ 74 کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ حالانکہ نواب وزیرالدولہ خود انگریزوں کے بہترین وفاداروں اور ان کے پسندیدہ فرماں رواؤں میں اونچے مقام پر فائز تھے لیکن ان کے فوجیوں اور کئی رشتے داروں نے نہ صرف انگریزوں کی مخالفت کی بلکہ دہلی پہنچ کر اپنی بغاوت کا اعلان بھی کیا

(تاریخ ریاست ٹونک[اردو]از ہنومان سنگھل۔ص-149)

نواب صاحب کے رشتے داروں کے سنگھل صاحب نے تاریخی حوالوں سے جو نام گنوائے ہیں ان میں نواب وزیرالدولہ کے بھائی صاحبزادہ محمد منیر خاں اور ان کے ماموں صاحبان میر عالم خاں اور عظیم اللہ خاں کے نام ہیں۔ ہنومان سنگھل لکھتے ہیں:" نواب کی فوج نے نواب کو قلعے میں قید کردیا تھا لیکن ان کے کچھ وفاداروں نے انھیں آزادی دلوائی۔ نواب کے بھائی صاحبزادہ محمد منیر خاں اور ان کے ماموں حافظ میر عالم خاں اور دوسرے ماموں عظیم اللہ خاں بغاوت میں شامل تھے۔ نواب نے بعد میں ریاست میں ڈونڈی پٹوائی کہ جو بھی باغی ان کی ریاست کی حدود میں داخل ہوگا اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی اعلان ہوا کہ کوئی بھی یوروپی افسر ریاست میں نہ آئے کیونکہ یہ علاقہ محفوظ نہیں ہے۔" (تاریخ ریاست ٹونک (اردو) ہنومان سنگھل ص-150)

مندرجہ بالا بیانات میں قدرے اختلاف کی وجہ وہ ماخذات ہیں جن سے مرتبین نے رجوع کیا۔ اصغر علی آبرو کی "تاریخ ٹونک" نواب امیرالدولہ کے پوتے اور ٹونک کے چوتھے فرماں روا نواب ابراہیم علی خاں کی خواہش پر لکھی گئی اور ان کی سرپرستی میں شائع ہوئی ہے۔ لہٰذا اس میں سرکاری مصلحتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے واقعات کا اندراج ہوا ہے اور جن تفصیلات سے سرکاری منشا کی خلاف ورزی کا اندیشہ تھا ان سے روگردانی کی گئی ہے۔ میر عالم خاں کی شہادت کے بیان اور ٹونک میں باغیوں کی آمد کی تفصیلات کو اس پس منظر میں دیکھنا مناسب ہوگا۔

میر عالم خاں صاحب ممتازالدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں استقامت جنگ کے بڑے بیٹے تھے۔ ایک زمانے میں اخوندزادہ محمد ایاز خاں مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے دربار میں رہ چکے تھے اور اکبر شاہ ثانی نے ان کے علم وفضل اور سپہ گری کے کمالات سے خوش ہوکر انھیں پرگنہ کوتانہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ ممتازالدولہ استقامت جنگ کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ محمد ایاز خاں صاحب نے اپنی اولاد کو بھی زیور علم اور کمالات حرب وضرب سے آراستہ کیا تھا۔

اخوندزادہ میر عالم خاں کا سال ولادت 1229ھ ہے اور عظیم اللہ کا 1233ھ جس کی تفصیل "تاریخ ٹونک" میں موجود ہے: "1229ھ میں بمشکوے مختارالدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں استقامت جنگ، فرزند تولد ہوا، میر عالم خاں نام رکھا گیا" (تاریخ ٹونک/آبرو۔ مقالہ دوم۔ص-16)

"اس سال (1233ھ) میں بمشکوے ممتازالدولہ فرزند تولد ہوا، محمد عظیم اللہ خاں نام رکھا گیا" (تاریخ ٹونک آبرو/ مقالہ دوم ص-20)

نواب امیرالدولہ کی اہلیہ امیر بیگم میر عالم خاں کی سگی بڑی بہن تھیں جن کا ذکر "تاریخ ٹونک" میں اس طرح آیا ہے:

"جنابہ امیر بیگم صاحبہ، دختر مختارالدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں بہادر استقامت جنگ و جنابہ آزاد بیگم صاحبہ دختر خان صاحب شہ... افغان حضرت نواب امیرالدولہ بہادر کی خاص بیبیاں تھیں۔ بطن دختر اخوندزادہ صاحب موصوف سے حضرت نواب وزیرالدولہ پیدا ہوئے، چنانچہ 1222ھ میں یہ ذکر آچکا ہے۔" (تاریخ ٹونک/آبرو۔ مقالہ دوم،ص-17)

نواب ٹونک سے اس قرابت داری کے ساتھ میر عالم خاں کی قرابت داری آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے بھی تھی۔ اس لیے بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان پر ٹوٹنے والی قیامت اور عہد کے المناک واقعات سے ان کا شدید طور پر متاثر ہونا فطری عمل تھا۔ ان حالات و واقعات کے زیر اثر میر عالم خاں نے ریاست ٹونک میں انگریز مخالف فضا قائم کرنے اور جنگ آزادی کو تقویت پہنچانے میں سرگرم حصہ لیا۔ انگریز حکام بہادر شاہ ظفر سے میر عالم خاں کی قرابت اور ان کی سرگرمیوں سے آگاہ تھے اس لیے انھوں نے نواب صاحب پر زور ڈالا کہ وہ میر عالم خاں اور ان کے بھائی عظیم اللہ خاں سے نجات حاصل کریں اور انھیں گرفتار کریں۔ ہنومان سنگھل تاریخ ریاست ٹونک میں لکھتے ہیں:

"اس طرح ٹونک کے نواب وزیرالدولہ نے صاحبزادہ محمد منیر خاں کو قید کرکے بیڑیوں میں ڈال کر قلعے میں بند کردیا۔ صاحبزادہ عظیم اللہ خاں عرف بنے میاں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اپنے ماموں حافظ میر عالم خاں اور ان کے فرزندوں کو گرفتار کرنے کے لیے سپاہی بھیجے گئے۔ مقابلے میں تلوار سے ماموں کی موت واقع ہوگئی اور بیٹے گرفتار کرکے ہتھکڑی بیڑیوں میں جکڑ کے قید خانے میں ڈال دیے گئے۔ اس مقابلے میں نواب کے چھ فوجی زخمی ہوئے تھے۔"

(تاریخ ریاست ٹونک[اردو]ہنومان سنگھل۔ص-151)

میر عالم خاں کے نانا عزیز خاں اکوزئی مقیم دہلی کی دو صاحبزادیاں فاطمہ خانم اور ماہ خانم تھیں۔ فاطمہ خانم اکبر شاہ ثانی کی بیگم تھیں اور ماہ خانم صاحبہ کا عقد اخوندزادہ محمد ایاز خاں سے ہوا جو ان دنوں دربار شاہی سے وابستہ تھے۔ بعد میں جب اکبر شاہ ثانی نے موصوف کو پرگنہ کوتانہ عطا کرتے ہوئے خطابات سے نوازا تو وہ کشن گڑھ (نزد اجمیر) آکر بس گئے۔ "تاریخ ٹونک" از آبرو میں ماہ خانم صاحبہ کا ذکر اس طرح آیا ہے: اہلیہ مختارالدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں بہادر استقامت جنگ یعنی حضرت نواب وزیرالدولہ بہادر کی نانی صاحبہ نے شیر گڑھ علاقہ کوٹہ راجپوتانہ میں بحالت قیام کہ وہاں اہل وعیال حضرت نواب امیرالدولہ سکونت پذیر تھیں، چار چھوکریاں بقیمت یک صد روپیہ سکہ کوٹہ باسمہ مفصلۂ ذیل خرید کی تھیں۔ ان میں سے ...زینت کا نکاح سرور خاں ولایتی ملازم سید علی شاہ صاحب داماد جناب ممتازالدولہ اخوندزادہ محمد ایاز خاں بہادر استقامت جنگ سے ہوا" (تاریخ ٹونک/آبرو۔ مقالہ دوم۔ص-23)

"تاریخ ٹونک" میں اخوندزادہ محمد ایاز خاں کے ایک اور داماد نواب محمد

عبدالغفور بہادر آف جاورہ کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن یہ محقق نہیں کہ ان کے یہ داماد ان کی کون سی بیٹی کے شوہر تھے۔ میر عالم خاں صاحب کے دونوں بیٹے شاہ عالم خاں اور شیر عالم خاں جو میر عالم خاں کی شہادت کے بعد زخمی حالت میں گرفتار کر لیے گئے تھے اور قلعۂ امیر گڑھ میں قید کر دیے گئے تھے، کچھ مدت بعد نواب صاحب جاورہ نے وزیرالدولہ پر زور ڈال کر انھیں اپنے پاس بلا لیا تھا۔ برسوں بعد وہ ٹونک واپس آئے۔

1857 کے غدر کے بعد ٹونک میں اس کے ردِعمل اور فوجی و سیاسی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے "تاریخ ریاست ٹونک" (اردو) میں ہنومان سنگھل لکھتے ہیں:

"ٹونک کی فوج نے دہلی سے آگرہ جا رہے باغیوں کو ٹونک آنے کی دعوت دی ان کی خاطر تواضع کی اور رسد فراہم کیا۔ ٹونک کی فوج کے زیادہ تر افسران مع سپاہ کے اپنی اپنی تنخواہ وصول کرنے کے بعد باغیوں کے ساتھ الگ سے بادشاہ کی مدد کو دہلی چلے گئے۔ ان جانے والوں میں 117 افراد پر مشتمل فوجی ٹکڑی کے ساتھ رسالدار مغل خاں، 153 افراد پر مشتمل فوجی ٹکڑی کے ساتھ رسالدار سید امانت شاہ، 29 فوجیوں کے ساتھ رسالدار عبدالغفار خاں، 5 فوجیوں کے ہمراہ رسالدار مرزا قائم بیگ، 76 فوجیوں کے ساتھ رسالدار احمد خاں اور 153 فوجیوں کے ساتھ رسالدار عالم بہار خاں۔ ان کے علاوہ 101 فوجیوں کے مالک رسالدار احمد من خاں اور سب سے بڑی فوجی ٹکڑی، جس میں 501 فوجی تھے، جس کے سردار رسالدار محی الدین مع اپنی فوج کے ٹونک سے دہلی کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ ٹونک سے جانے والے سبھی باغیوں نے دہلی پہنچ کر دہلی کے اجمیری گیٹ پر پڑاؤ ڈالا تھا اور بادشاہ کو اپنی آمد کی اطلاع بھیجی تھی۔ ان فوجیوں نے کئی مرتبہ انگریزوں سے ٹکر لی۔ یکم اگست 1857 کو ہوئے مقابلے میں ان لوگوں نے 18 انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتارا جبکہ ان کے بھی تین افسر شہید ہوئے۔ لیکن ان فوجیوں کے اخراجات کا انتظام چونکہ دہلی کا بادشاہ نہ کر سکا لہٰذا ان لوگوں نے رفتہ رفتہ دہلی سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ایک دوسری لڑائی 13 اگست کو بھی ہوئی۔ 31 اگست 1857 تک ان ڈیڑھ ہزار باغیوں میں سے صرف دو سو باقی بچے تھے۔ تقریباً تیرہ سو فوجی یا تو موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے یا ٹونک واپس چلے گئے تھے، جہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔"

("تاریخ ریاست ٹونک" [اردو] ہنومان سنگھل۔ ص 151-150)

میر عالم خاں کی بڑی بہن اور نواب وزیرالدولہ کی والدۂ ماجدہ امیر بیگم کا انتقال 1260ھ میں بیت اللہ شریف میں ہوا۔" 1260ھ میں جناب عالیہ قدسیہ والدۂ حقیقی حضرت نواب وزیرالدولہ بہادر بیت اللہ شریف تشریف لے گئیں، وہاں پہنچ کر انتقال فرمایا اور ان کو قریب مزار حضرت شیخ ابوالحسن شاہ مولی رحمۃ اللہ علیہ کے دفن کیا۔"

(تاریخ ٹونک/آبرو۔ مقالہ دوم۔ ص-36)

حصول آزادی کے بعد جب ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہوئی اور اس نے مجاہدین آزادی کے ورثا کو وظیفے جاری کرنے کا اعلان کیا تو میر عالم خاں کے حقیقی پوتے احمد خاں نازش مرحوم نے حکومت ہند سے انھیں بھی وظیفہ جاری کرنے کی درخواست کی تھی۔ وہ اسے صرف مالی منفعت کے لیے نہیں بلکہ ایک اعزاز کے طور پر بھی حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے صدر جمہوریۂ ہند سے بھی درخواست کی تھی اور ایک منظوم خط وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں بھی ارسال کیا تھا۔ افسوس کہ داعیِ اجل نے انھیں مہلت نہ دی اور ان کی وفات کے بعد یہ معاملہ معرضِ التوا میں جا پڑا۔ نازش صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کو جو منظوم خط لکھا وہ حسب ذیل ہے:

وزیر اعظم ہندوستاں، جواہر لال
دعا گو ہم پہ تو بالغدو والآصال
لڑی ہے آپ نے جس طرح جنگِ آزادی
اسی طرح مرے آبا نے بھی کیا ہے قتال
سوادِ سوات سے آ کر ہوئے مصاحب شاہ
جناب خان محمد ایاز ذی اقبال
مراد شاہ سے ہے، شاہ عالم ثانی
انھی کی داد و دہش سے ہوئے وہ مالامال
کتانہ پرگنہ جاگیر میں ملا اُن کو
دکھائے شاہ کو اتنے سپہ گری کے کمال
خطاب اُن کو دیا امتیاز دولہ کا
بڑھایا شاہ نے اس طرح ان کا جاہ و جلال
ہے جزوِ ثانی القاب، استقامت جنگ
کہ استقامت و قوت تھیں ان کی قومی خصال
عزیز خاں اکوزئی تھے جو ساکنِ دہلی
تھیں ان کی پشت سے دو دخترانِ فرخ فال
تھیں ایک فاطمہ خانم محلِ اکبر شاہ
یہی ہیں مادر شاہِ ظفر، حریفِ جدال
بہن حقیقی انھی کی، جو ماہ خانم تھیں
ایاز خاں کی بنیں اہل، وہ فرشتہ خصال
پسر تھے ان کے مرے دادا، میر عالم خاں

ہوئے شہید جو ہنگامِ غدر، بعدِ قتال
شریکِ حرب رہے ان کے میرے والد و عم
ہوئے جو جنگ میں مجروح اور اسیرِ و بال
تعلقات ظفر سے جو تھے عزیزانہ
تھی ان سے قطع نظر، عین وقتِ تخت محال
رئیسِ ٹونک نے چاہا کہ کرلے ان کو اسیر
وہ ننگ سمجھے اسیری کو، بے جدال و قتال
جنھوں نے حصہ لیا تھا بہ جنگِ آزادی
جو وارث ان کے ہیں، پنشن سے ہوگئے خوشحال
مجھی کو تینوں کے ورثے پہنچتے ہیں شرعاً
ہے بحرِ حکم وظیفہ، یہ عرضِ حال ارسال
جو صدرِ ہند سے درخواست کی ہے نازش نے
اسی کی یاددہانی ہے یہ گزارشِ حال

اس نظم سے جہاں احمد خاں نازش کی قادرالکلامی اور شعری مشاقی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان واقعات کی تصدیق بھی ہوتی جاتی ہے جو گذشتہ صفحات میں تاریخی کتب کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں۔

مضمون کے آخر میں کچھ تسامحات کی نشاندہی ضروری ہے۔ ممتاز الدولہ اخوند زادہ محمد ایاز خاں صاحب استقامت جنگ کے ذکر میں تاریخ ٹونک/آبرد میں ان کے خطاب کے نصف اوّل کو کہیں مختارالدولہ لکھا گیا ہے اور کہیں ممتاز الدولہ۔ والد صاحب کی نظم میں یہ امتیاز دولہ نظم کیا گیا ہے۔ نظم میں شاید ضرورت شعری کے تحت ایسا کیا گیا ہے کہ ''ممتاز یا مختار'' یہاں نظم نہیں ہو رہے ہیں لیکن اصغر علی آبرو صاحب کی تحریر میں اس کا جواز کیا ہے۔ اس لیے یہ ایک تحقیق طلب بات ہے کہ خطاب کے صحیح الفاظ کیا ہیں مختارالدولہ یا ممتاز الدولہ۔ امتیاز الدولہ کی ترکیب ممتاز الدولہ کی طرف اشارہ ضرور کرتی ہے۔

دوئم یہ کہ بعض مورخین نے بہادر شاہ ظفر کو اکبر شاہ ثانی کی ہندو رانی لال بائی کے بطن سے قرار دیا ہے جبکہ والدِ مرحوم نازش صاحب نے اپنی مندرجہ بالا نظم میں انھیں فاطمہ خانم دختر عزیز خاں اکوزئی کا بیٹا کہا ہے۔ مولف ''تاریخ ٹونک'' نے صرف شاہزادہ مرزا سلیم شاہ بہادر سے نواب وزیرالدولہ کی قربت قریبہ کا ذکر کیا ہے:

''چونکہ عہد نامۂ امیر صاحب التدبیر میں یہ شرط مندرج تھی کہ صاحب زادہ بلند اقبال محمد وزیر خاں بہادر چند روز دہلی میں منتظم الدولہ مسٹر مٹکلف صاحب بہادر کے پاس رہیں تا واسطۂ اتحاد، مابین امیر اور صاحبان عالیشان کے مستحکم ہو جاوے بناءً علیہ اپنے فرزند دلبند کو ہمراہ سید علی شاہ صاحب اپنے ہم زلف کی ہمراہی میں جماعت سوار و پیادہ بجانب دلّی رخصت کیا...... دوسرے دن منتظم الدولہ مسٹر مٹکلف صاحب بہادر جناب صاحبزادہ صاحب کی فرودگاہ پر تشریف لائے اور دلجوئی مربیانہ فرما کر نہایت خاطر داری اور تسلی فرمائی۔ پھر جناب صاحبزادہ صاحب بہادر کو پیش کش عمدہ پیش کرکے رخصت کیا۔ چونکہ شاہزادہ مرزا سلیم شاہ بہادر سے جناب صاحبزادہ صاحب موصوف کی قربت قریبہ تھی لہٰذا محل شاہی سے واسطے ملاقات جناب صاحبزادہ صاحب بہادر موصوف کی طلب بتاکید ہوئی۔ بناءً علیہ صاحبزادہ موصوف نے معرفت منتظم الدولہ کے جناب شاہزادۂ والا جاہ بہادر سے ملازمت حاصل کرکے بعنایات سلاح فاخرہ وغیرہ کے افتخار حاصل کیا۔ پھر ہمیشہ شاہزادہ مرزا سلیم شاہ بہادر بہ بہجت قرابت قریب اور منتظم الدولہ مٹکلف صاحب بہادر بخیال انضباط رابطۂ اتحاد جناب صاحبزادہ صاحب سے ملا کرتے اور بنا بر اظہار رضامندی و خوشنودی کے انعام واکرام سے سرفراز فرماتے رہے تا آنکہ حضرت اکبر شاہ بادشاہ دہلی سے سندِ خطاب نواب وزیرالدولہ امیرالملک بہادر نصرت جنگ عطا ہوئی۔'' (تاریخ ٹونک/اصغر علی آبرو۔ مقالہ دوم۔ ص-18)

احمد خاں نازش صاحب نے نظم میں اغلباً حقیقی کے بجائے معنوی مفہوم لیتے ہوئے فاطمہ بیگم کو بہادر شاہ ظفر کی ماں یوں تسلیم کرلیا کہ اکبر شاہ ثانی کا ہر بیٹا فاطمہ خانم کا بھی بیٹا ہوا۔

آخر میں یہ اطلاع بھی آپ کو دیتا چلوں کہ میر عالم خاں صاحب خلف اخوند زادہ محمد ایاز خاں صاحب راقم الحروف کے اور راقم الحروف کے بڑے بھائی سلطان محمد خاں کے، جنھیں ادبی دنیا مخمور سعیدی کے نام سے جانتی ہے، سگے پردادا تھے۔ ہمارے دادا شیر عالم خاں ان کے دوسرے بیٹے تھے اور 12 سال کی عمر میں ان کے ساتھ شریک معارب ہوکر زخمی ہوگئے تھے۔ بعد میں جب وہ شعر کہنے لگے تو زخمی ہی تخلص رکھ لیا۔ 1857 کی جنگ آزادی کو 'غدر' قرار دے کر بعض لوگوں نے مطعون بھی کیا ہے اور ایسے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ 1957 میں جب اس جنگ کی صد سالہ تقریب منائی جارہی تھی تو مخمور صاحب نے ایک نظم کہی تھی جس کا آخری بند یہ ہے:

تمھارے شوقِ شہادت کی بے ریائی پر
دھرے جو نام کوئی کم سواد دھرتا ہے
جسے ملا ہے شہادت کا شوق ورثے میں
تمھیں وہ شاعرِ سرکش سلام کرتا ہے

Anees Kitab Ghar,
Meer Alam Khan Mainsion,
Ghair Meer Alam Khan,
Ameer Ganj, Tonk (Rajasthan)

ابن کنول

عرب کے بدوی اور ہندوستان کے دیہی سماج کی مماثلت

عرب اور ہندوستان کا تعلق بہت قدیم ہے۔ اہلِ ہند سمندر کے راستے سے عرب ممالک میں تجارت کے لیے جایا کرتے تھے اور عرب کے لوگ ہندوستان آتے تھے۔ ایران کا حاکمانہ رسوخ عرب کے ساحلی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا اور ایران کی فوج میں ہندوستانی بھی شامل تھے جو عرب کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف جہازوں اور کشتیوں پر ملازمت کرتے تھے بلکہ ہندوستان کی اشیا کی عرب میں تجارت بھی کرتے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں بہت سے عرب آکر آباد ہوگئے تھے۔ لکشدیپ اور کیرالہ میں آج بھی عربی النسل خاندان موجود ہیں ان کے رسم و رواج سو فی صد نہیں تو پچاس فیصد وہی ہیں جو عربوں کے ہیں۔ سندھ ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جس سے عربوں کا خصوصی تعلق رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سندھ کے راجاؤں پر ایران کا حاکمانہ اثر تھا اور ایران کے بادشاہ سندھ کے لوگوں کو اپنی فوج میں ملازم رکھتے تھے۔ بعد میں سندھ باقاعدہ اسلامی حکومت میں شامل ہوگیا تھا۔ سندھ کا عرب میں ہونے سے جب عرب سے قریب بھی تھا۔ دونوں ملکوں کے باشندے سمندری راستے سے ایک دوسرے کے ملکوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں، پھر رسول اللہؐ کے عہد میں اور پھر اس کے بعد ہندوستان اور عرب کے تجارتی تعلقات قائم رہے۔ خود رسول اللہ اور صحابہ کرامؓ ہندوستان کی بہت سی چیزوں کو استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہندوستان سے جانے والی بہت سی اشیا عرب کے بازاروں میں بکتی تھیں۔ ان میں کافور، صندل، لونگ، مشک، عود، زنجبیل، مسالے، نباتاتی کپڑے، روئی کے مخملی کپڑے وغیرہ ہندوستان کی تلواریں، نیزے اور تیر بھی عرب میں پسند کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں عرب کے ساحلی علاقوں خصوصاً ابلہ، صحار، جارعدان اور دبا وغیرہ بازاروں میں ہندوستان کا بہت سامان فروخت ہوتا تھا۔ عرب و ہند کے تجارتی اور معاشی تعلقات آہستہ آہستہ تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور ثقافتی تعلقات بن گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہلِ ہند بھی بت پرست تھے اور عہد جاہلیت میں عرب میں بھی بت پرستی کا رواج تھا۔ دونوں جگہ بڑے بڑے بت خانے تھے۔ دونوں ملکوں کے لوگ چاند ستاروں اور سورج کے علاوہ بہت سی چیزوں کی پوجا کرتے تھے۔ لیکن بدوؤں میں مذہب نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی دیوی دیوتا سے کوئی خاص عقیدت نہیں تھی۔ وہ اپنے قبیلوں کے رسم و رواج پر ہی قائم رہتے تھے۔ ان کے یہاں مظاہر پرستی زیادہ تھی۔ جو چیز انھیں فائدہ پہنچاتی تھی وہ قابلِ احترام تھی۔ مثلاً ریگستان میں چشمہ یا کنواں، جس کا پانی زندگی کا لازمی جزو ہے اس لیے پوجا کے لائق سمجھا گیا۔ اکثر لوگ پانی اپنے عزیزوں اور دوستوں کو تحفے کے طور پر دیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں اگرچہ دریاؤں کی بہتات ہے لیکن یہاں بھی دریاؤں کی پوجا ہوتی ہے، دریاؤں کو ماں کا درجہ حاصل ہے۔ اہلِ ہنود ان دریاؤں کا پانی اپنے گھروں پر لے جاتے ہیں عزیزوں اور دوستوں کو تحفے میں دیتے ہیں اور آبِ زم زم کی طرح متبرک مانتے ہیں، خصوصاً راجستھان کے صوبے میں جہاں کا زیادہ علاقہ عرب کی طرح ریگستان پر مشتمل ہے۔ یہاں کے باشندے آج بھی بدوؤں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ پانی کی تلاش میں سرگرداں و پریشان رہتے ہیں۔

ہندوستان آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ یہاں پر ہر مذہب و ملت کے لوگ بستے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بدھ، جین وغیرہ۔ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ غربت کی زندگی گزارتا ہے۔ اس لیے تلاشِ معاش میں یہ لوگ ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ خانہ بدوشی انسان کی فطری ضرورت ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انسان نقل مکانی اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں دو طریقوں سے انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک خانہ بدوشی کے انداز میں اور دوسرے مستقل رہائش کے طور پر۔ مستقل بسنے والے عموماً شہروں میں رہتے ہیں ان کے پاس زندگی کی تمام ضروری اشیا موجود ہوتی ہیں اور یہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔ دوسرا طریقہ زندگی انتہائی مشکل ہے۔ ان کی رہائش گاہ عارضی ہوتی ہے۔ جہاں جاتے ہیں وہیں عارضی مکان بن جاتے ہیں۔ کبھی خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں، کبھی مٹی اور پتھروں کی دیواریں کھڑی کرکے گھاس اور لکڑیوں کی چھت ڈال کر گھر بنا لیتے ہیں تاکہ سردی اور گرمی سے محفوظ رہیں۔ کبھی غاروں اور کھوؤں میں پناہ لیتے ہیں۔ ان کی ضرورتیں کم ہوتی ہیں۔ جب چاہے اپنے گھر کو کاندھے پر اٹھا کر دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ کے ساتھی ان کے جانور ہوتے ہیں۔ اونٹ، گھوڑے، گدھے، خچر، بھیڑ، بکریاں، گائے، بیل وغیرہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جانور سواری اور باربرداری کے کام آتے ہیں اور کچھ غذا فراہم کرتے ہیں۔ ہندوستان میں شہری آبادی بہت مختصر ہے۔ یہاں کے اسّی فی صد لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے پاس مستقل گھر نہیں ہوتے۔ مٹی یا گھاس پھونس کی دیواریں کھڑی کرکے عارضی گھر بنا لیتے ہیں۔ جو انھیں صحیح طور سے نہ بارش سے بچاتا ہے، نہ آندھی طوفان اور سردی سے۔ ان کا طرزِ رہائش عربوں کے بدوؤں کی طرح ہے۔ یہ اپنی بیشتر ضرورتیں قدرتی اشیا سے پوری کرتے ہیں۔ شہر کی مصنوعات کی نہ ان کے دل میں خواہش ہوتی ہے اور نہ آسانی سے فراہم ہو پاتی ہیں۔ جانوروں کو اپنا ہمراز اور ہم سفر بناتے ہیں اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ہندوستان کے دیہی علاقوں کے باشندوں یا خانہ بدوشوں کا طرزِ زندگی بدوی سماج سے کافی مماثلت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں بدوی انداز میں زندگی گزارنے

والے دیہات میں بستے ہیں ہندوستان بھی عرب کی طرح گرم ملک ہے۔ اس لیے یہاں کے لوگ بھی کھلی جگہوں میں درختوں کے سائے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہاں کا لباس بہت مختصر تھا مرد ایک چادر تہبند کی طرح باندھتے تھے اور ایک اوپر ڈال لیتے تھے۔ سر کو دھوپ سے بچانے کے لیے ڈھکتے تھے۔ سلا ہوا کپڑا نہیں پہنتے تھے، ننگے پیر رہتے تھے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد سلے ہوئے کپڑے کا رواج عام ہوا لبے کرتے اور پاجامے پہننے لگے اور جوتے بھی اب ہندوستان کے دیہی سماج میں ہندو کرتے کے ساتھ دھوتی پہنتے ہیں اور مسلمان پاجامہ، سر پر پگڑی دونوں کے ہوتی ہے۔ سکھ قوم کے لوگ سر پر ہمیشہ پگڑی رکھتے ہیں۔ مسلمان اور سکھ عورتیں شلوار قمیض پہنتی ہیں اور ہندو عورتیں ساڑی باندھتی ہیں۔ عرب اور ہندوستانی سماج میں زیورات میں بھی بہت یکسانیت ہے۔ مرد قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ عورتیں سر سے پیر تک سونے چاندی کے زیورات سے خود کو آراستہ کرتی ہیں۔ انگلیوں میں انگوٹھیاں گلے میں عقد (مالا) کانوں میں قرط (بندے) ناک میں خزام (نتھ) ہاتھوں میں کنگن، پیروں میں خلخال یا پازیب وغیرہ عام زیورات ہیں عرب و ہندی عورتیں ہتھیلیوں اور پاؤں کے تلووں پر مہندی اور آنکھوں میں سرمہ بھی لگاتی ہیں۔ بدوی عورتوں کی طرح ہندوستانی عورتیں بھی خوشبو لگانا پسند کرتی ہیں۔ بدوی عورتیں اور مرد اپنے ہاتھوں اور بعض جسم کے دوسرے اعضا کو گدھواتے تھے۔ ہندوستان میں کوئی عبارت یا پھول بنواتے تھے۔ عورتیں اور مرد دونوں آج بھی اپنے بازوؤں اور بدن کے دوسرے اعضا پر نام اور پھول گودھواتے ہیں۔

جزیرہ عرب کا بیشتر حصہ کیونکہ ریگستان پر مشتمل تھا۔ یہاں پانی اور سرسبز شاداب میدانوں کی کمی ہے۔ اونٹ جیسا صابر وحلیم جانور اللہ تعالیٰ نے یہاں پیدا کیا۔ یہ جانور بغیر کھائے پیے کئی کئی دن تک سفر کرسکتا ہے۔ یہ سرسبز پتوں اور گھاس کے بجائے ریگستان کے کڑوے کسیلے پتوں اور کھارے پانی پر گزارا کرسکتا ہے۔ سرد ہوائیں اس کے لیے مضر ہیں۔ ریگستان کی آب و ہوا اس کے مزاج کے موافق ہوتی ہے۔ بدوؤں کی زندگی میں اونٹ ریڑھ کی ہڈی تھا۔ یہ اس پر سفر بھی کرتے تھے۔ اس کا دودھ اور گوشت بھی استعمال کرتے تھے۔ اور اس کی کھال اور اون سے کپڑے اور خیمے بناتے تھے۔ بدوی سماج میں زندگی کے ہر شعبہ میں اونٹ کام آتا تھا۔ اس کی تجارت بھی ہوتی تھی شادی بیاہ میں مہر کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ گویا اونٹ اس سماج کا ایک اہم حصہ تھا۔ اونٹ کی یہی قدر وقیمت ہندستان کے صوبہ راجستھان میں ہے۔ یہاں کے سماج میں اونٹ انسان کا سب سے بڑا اور اہم دوست ہے۔ یہ نہ صرف سفر اور سامان لانے لے جانے کے کام آتا ہے بلکہ کھیتی باڑی میں بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔

بدوی سماج میں گھوڑے کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ عربی النسل گھوڑے پوری دنیا میں مشہور تھے، یہ جانور انتہائی سخت جان، نجیب اور شریف ہوتا ہے۔ دنیا کے بیشتر بادشاہوں نے دور دراز کے سفر کے لیے گھوڑے ہی کا استعمال کیا ہے۔ عرب میں اس کی دیکھ ریکھ اور نسل کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اہل عرب اپنے گھوڑوں کی بہت خدمت کرتے تھے۔ انھیں اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اس لیے ان کے گھوڑے یوروپین گھوڑوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوتے تھے۔ عربوں کو جنگ و دفاع کی وجہ سے گھوڑوں کی بہت ضرورت پڑتی تھی۔ اہل ہند بھی گھوڑوں کا خاص شوق رکھتے تھے۔ زمانہ قدیم میں یہاں کے راجہ ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ اچھی نسل کے گھوڑے بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد سفر کے لیے گھوڑے کا استعمال زیادہ عام ہو گیا۔ یہاں بھی مختلف نسل کے گھوڑے پائے جاتے تھے۔

اونٹ اور گھوڑے کے علاوہ بدوی سماج میں بھیڑ بکریوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان کا نہ صرف دودھ پیتے تھے بلکہ گوشت بھی کھایا جاتا تھا۔ بھیڑ بکریوں کو پالنا اور چرانا زمانہ قدیم سے عربوں میں رائج تھا۔ ہندوستان میں آج بھی ایک طبقہ بھیڑ بکریاں پالتا ہے اور چراتا ہے۔ یہ گڈریے یا چرواہے کہلاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان میں بکریوں کے غول کو لے کر گھاس اور سبزے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ جہاں پانی یا گھاس ملتی ہے ٹھہر جاتے ہیں۔ بھیڑیے سے بکریوں کی حفاظت کے لیے شکاری کتے ساتھ رکھتے ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے اپنے ڈیرے پر واپس آجاتے ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش بکریوں کا دودھ ہوتا ہے۔ ان کی عورتیں آگ جلانے کے لیے سوکھی لکڑیاں اکٹھی کرتی ہیں۔ بھیڑ بکریوں کی مینگنیوں کو بھی جلانے کے کام میں لاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دو گائے یا بھینس بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بدوی سماج میں عموماً تجارت اور دیگر پیشوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔ ان لوگوں کا مزاج تجارتی نہیں تھا۔ ضروریات محدود تھیں طبیعت میں قناعت پسندی تھی۔ سادہ کھانا، سادہ پہننا ان کی فطرت تھی۔ یہ لوگ مزاجاً سادہ اور جولے بھالے ہوتے تھے لیکن بدویانہ زندگی گزارنے، جنگلوں اور ویرانوں میں رہنے کے سبب بہادر اور نڈر ہوتے تھے۔ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے مضبوط تھے، پُرخطر خطرات کا سامنا کرتے تھے سیر و شکار بھی شوق میں شامل تھا۔ ساحلی علاقوں میں رہنے والے بدو مچھلیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ اور بیابان میں مقیم لوگ ہرن اور نیل گائے کے علاوہ شیر اور چیتے کا بھی شکار کرتے تھے۔ شکار اور دفاع کے لیے عرب اور ہندوستان کے ہتھیار یکساں تھے، تلوار، نیزے، منجنیق اور تیر و کمان دونوں ملکوں میں استعمال ہوتے تھے۔ جبکہ عرب میں ہندی تلوار، ہندی نیزے بہت پسند کیے جاتے تھے۔

مچھلیوں کا شکار ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں آج بھی ہوتا ہے۔ اور مچھلی وہاں بسنے والوں کے خاص کھانوں میں شامل ہے۔ یہ لوگ بدوی انداز میں چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے طور پر خیموں یا جھونپڑیوں میں سمندر کے کنارے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی شہر کے رہنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ رہن سہن،

شادی بیاہ کے طریقے بھی الگ ہوتے ہیں۔ جنگلی جانوروں کا شکار ہندو راجہ بھی کرتے تھے اور ہندوستانی مسلمان تو اس کے خاص شوقین تھے۔ یہ شکار تیروں، بھالوں اور تلواروں سے کیے جاتے تھے۔ دیہی لوگ نہ صرف اپنی حفاظت کے لیے جنگلی جانوروں کا شکار کرتے ہیں بلکہ ان کا گوشت غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بدوی سماج میں بھی شکار کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

جس طرح بدوی سماج قبیلوں میں بٹا ہوا تھا اور ان قبیلوں میں خاندانی عصبیت پائی جاتی تھی۔ اپنی برتری کے لیے ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑے ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ خاندانی یا قبائلی جھگڑے برسوں اور نسل در نسل چلتے تھے۔ اپنی قوت و ثروت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اسلام کے مساویانہ تصور کے بعد اس میں کچھ کمی آئی۔ لیکن خاندان اور قبیلے کی برتری کا احساس ہر زمانہ میں رہا۔ ہندوستانی سماج میں یہ احساس آج بھی باقی ہے۔ یہاں کے لوگ مختلف برادریوں میں تقسیم ہیں عربوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی اعلیٰ نسبی پر فخر کرتے ہیں۔ اپنی اپنی برادری کے طاقتور اور اعلیٰ نسب ہونے کا احساس سب کو ہوتا ہے۔ ہندوستان کا پورا سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں چار بنیادی طبقے ہیں برہمن سب سے اعلیٰ طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ تمام مذہبی امور یہی طے کرتا ہے دوسرا چھتری کا ہے۔ یہ عام طور پر جنگجو ہوتے ہیں۔ تیسرا ویش اور چوتھا شودر کہلاتا ہے۔ ان کے علاوہ پیشے کے اعتبار سے ہندوستانی سماج برادریوں میں تقسیم ہے۔ مثلاً دھوبی، موچی، نٹ، ملاح، مچھیرے، جولاہے وغیرہ آخرالذکر طبقات شہروں میں نہیں رہتے۔ بلکہ شہر سے دور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان میں بعض بستیاں مستقل گاؤں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور بعض خانہ بدوش زندگی کو ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ ان برادریوں کا ملکی قانون سے الگ اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ جس طرح بدوی سماج میں قبیلے کا حاکم اعلیٰ سرپرست یا شیخ کہلاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے دیہی سماج میں وہ سرپنچ، مکھیا، سردار یا پٹیل کہلاتا ہے۔ برادری کے کسی بزرگ کو سردار بنایا جاتا ہے اس کے ساتھ برادری یا قبیلے کے کچھ اور معمر لوگ ہوتے ہیں انھیں تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ برادری کے کسی فرد کی غلطی پر یہ اسے سزا دے سکتے ہیں۔ برادری سے باہر کر سکتے ہیں۔ پوری برادری یا قبیلہ ان کی بات مانتا ہے۔ عموماً کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے معاملات عدالت یا پولیس تک نہ پہنچیں۔ سرپنچ یا سردار کے فیصلوں پر پورا عمل کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو برادری سے سزا کے طور پر باہر کیا جاتا ہے تو پھر اسے کہیں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ ہندوستان میں بھی بدوی سماج کی طرح برادریوں کے نام ہوتے ہیں۔ برادری یا قبیلہ کا ہر فرد قبیلے کی عزت کے لیے جان دینے یا لینے کو تیار رہتا ہے۔ گاؤں، قبیلہ یا خاندان کی عزت سب سے بالاتر ہوتی ہے ازدواجی رشتے قبیلے ہی میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ قبائل عام طور پر اپنا نظام خود ہی چلاتے ہیں اپنی حفاظت بھی خود ہی کرتے ہیں۔ مردانگی، بہادری اور خودداری ان کے کردار کے خاص عنصر ہیں اور ان خصائص کا ذکر جس طرح عربی شاعری میں موجود ہے اسی طرح ہندوستان کے عوامی گیتوں اور قصوں میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عہد جاہلیت میں بہت سی برائیاں بدوی سماج میں موجود تھیں مثلاً شراب نوشی، جوا، لوٹ مار۔ اسلام کے نزول کے بعد یہ برائیاں عربوں میں تو دور ہو گئیں لیکن ہندوستانی سماج میں آج بھی موجود ہیں۔ شراب نوشی پر پابندی نہیں ہے، جوا خوب کھیلا جاتا ہے سزاؤں کی نرمی کے سبب لوٹ مار اور زناکاری پوری طرح ختم نہیں ہو پائی۔ ڈاکو اور ٹھگ آج بھی ہندوستان میں سرگرم ہیں۔ بدوی سماج میں لوٹ مار معاشی اور سماجی حالات کے پیش نظر زندگی کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ لوٹ مار کو بہادری اور مردانگی کا وصف مانا جاتا تھا۔ ہندوستان کے دیہی سماج کے افراد بھی سماجی ناانصافی، محرومی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے لوٹ مار کی راہ اختیار کرتے ہیں ہندوستان کے دیہی سماج میں سیر و تفریح اور ضروریات زندگی کے سامان بہت کم دستیاب ہوتے تھے اس لیے یہاں آئے دن بازار اور پورے سال میلے لگتے رہتے ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں رہنے والے نہ صرف سیر و تفریح کرتے ہیں بلکہ ضرورت کا سامان بھی خریدتے ہیں۔ ہندوستان میں سال کے بارہ مہینوں سے زیادہ تہوار اور میلے ہوتے ہیں۔ کبھی فصل کے کٹنے کی خوشی میں، کبھی موسم کی ابتدا پر، کبھی دسہرے پر، کبھی عید اور محرم پر میلے لگتے ہیں۔ ان میلوں میں اونٹوں، گھوڑوں اور بیل گاڑیوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ مینڈھے اور مرغے لڑائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں دریاؤں کو مقدس مانا جاتا ہے۔ ہندوؤں کو یقین ہے کہ ان مقدس دریاؤں میں نہانے سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ اس لیے یہاں آئے دن لوگ نہانے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور ایک میلہ سا لگتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازار لگتے ہیں۔ جہاں ضروریات کی تمام اشیا کے ساتھ ساتھ جانور یعنی گائے، بیل بھینس، اونٹ، بھیڑ، بکریوں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان میلوں کی نوعیت عکاظ، ذوالمجاز، الرابیہ، دومۃ الجندل، مشقر، ذوبا، شجر، حجر وغیرہ کے میلوں جیسی ہوتی ہے۔

جس طرح عربوں میں زمانہ جاہلیت میں بت پرستی اور جہالت غالب تھی اسی طرح ہندوستانی سماج میں بھی بت پرستی اور جہالت چھائی ہوئی تھی۔ ہر پتھر کو دیو مانتے تھے جہالت کے سبب توہم پرستی یہاں کے سماج میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ سورج گرہن اور چاند گرہن سے خوفزدہ ہونا۔ نجومیوں اور جیوتشیوں سے مستقبل کا حال جاننا۔ نہ صرف قدیم ہندوستان میں عام تھا بلکہ آج بھی ہے۔ عرب سماج میں بھی علم غیب کی باتیں جاننے کے لیے کاہنوں سے رابطہ کیا جاتا تھا۔ یہ کاہن نجومیوں کی طرح ہوتے تھے، جنوں اور شیطانوں کی مدد سے مستقبل کا حال جاننے کی کوشش کرتے اور جہلا کو بے وقوف بناتے تھے۔ ہندوستانی سماج میں بھی کاہنوں پر یقین کیا جاتا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے فال نکالنا بھی رائج تھا۔

بدوی سماج کے لوگ خصلتاً کم چالاک اور سیدھی سادی طبیعت کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے توہمات میں پھنس جاتے ہیں۔ جادو منتر ٹونے ٹوٹکے ان کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جسمانی طور پر شجاع اور قوی ہونے کے باوجود اپنے رہن سہن

کے اندر اور طرز زندگی کے سبب اپنے آپ کو شہری لوگوں کے سامنے کمتر سمجھتے ہیں۔ اس احساسِ کمتری کے سبب شہر کے لوگ اپنی برتری کا احساس دلا کر ان سے محنت و مشقت کے کام بھی لیتے ہیں۔ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں رہنے والے افراد کی بھی بدوؤں جیسی حالت ہے۔ دیہی افراد بہت سی چیزوں کے لیے شہر کے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں اناج، جانور یا ان کا دودھ یا ان کی کھال وغیرہ ہی دیہات میں بسنے والوں کی کل کائنات ہوتی ہے۔ لیکن صرف یہ چیزیں زندگی گزارنے کے لیے ناکافی ہیں۔ اس لیے شہر کے بازاروں میں جا کر اپنی چیزیں فروخت کر کے بعض ضروری اشیا خریدتے ہیں۔ بعض اوقات بعض دیہی افراد شہری چمک دمک دیکھ کر مرعوب بھی ہوتے ہیں۔ لیکن بہت جلد اس سے نکل کر بھاگتے ہیں۔ کھلے آسمان میں، آلودگی سے پاک اپنی فطری زندگی کو ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

عرب کے بدوی سماج اور ہندوستان کے دیہی سماج کی ایک اور مماثلت دونوں کے یہاں عورت کی اہمیت ہے۔ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ شہر کی عورتوں کے مقابلے میں مضبوط اور محنتی ہوتی ہیں۔ وہ نہ صرف گھر میں کھانا پکاتی ہیں بلکہ جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتی ہیں۔ کنوؤں سے پانی لے کر آتی ہیں، جانوروں کا دودھ دوہتی ہیں۔ بدوی سماج میں عورت کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنے شوہر کا انتخاب خود کرے۔ ہندوستانی سماج میں بھی ہندوؤں میں سوئمبر کی رسم ہوتی تھی۔ بہت سے مرد جمع ہوتے تھے۔ عورت جس کو چاہے اپنے لیے منتخب کرتی تھی۔ البتہ عربوں کے بعض قبائل لڑکیوں کی پیدائش کو پسند نہیں کرتے تھے اور انھیں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام کے آنے کے بعد یہ لعنت ختم ہوئی لیکن ہندوستانی سماج میں یہ برائی اور لڑکیوں سے نفرت آج بھی موجود ہے۔ عورتوں میں پردے کا رواج نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں ہے بلکہ دیہات کی ہندو عورتیں بھی پردہ کرتی ہیں۔ بدوی اور ہندوستانی سماج میں ایک مماثلت یہ بھی تھی کہ اگر کسی عورت کا شوہر مر جاتا تو اگر اس کا کوئی بھائی اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا تو اس کے اوپر اپنی چادر ڈال دیتا اور پھر دونوں کی شادی ہو جاتی۔

ہندوستانی دیہی سماج کا ایک وصف مہمان نوازی بھی ہے۔ یہ لوگ کیونکہ طبعاً بھولے بھالے ہوتے ہیں، مسافر یا مہمان کی مدد یا تواضع کو ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ مہمان کو اچھی سے اچھی طرح بٹھاتے ہیں اسے پانی، دودھ، لسی، مٹھا، چھاچ پیش کرتے ہیں۔ مہمان کو بھگوان مانتے ہیں۔ مہمان نوازی بدوی سماج کی بھی ایک اہم خوبی ہے۔ بدوی دشمن کے لیے چاہے کتنا ہی سخت اور خطرناک ہوں لیکن مہمان کے لیے دل و جان فرشِ راہ کر دیتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ لوگ شہر کی خود غرضانہ زندگی سے بالکل مختلف ہیں۔ مہمان کی تواضع میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ کسی مہمان یا مسافر کو کھانا کھلانے کے بعد اس کی حفاظت کرنا بھی اپنی ذمے داری سمجھتے ہیں۔

ہندوستانی دیہی سماج میں حقے کا عام رواج ہے ہر آنے والے مہمان کی حقے سے تواضع کی جاتی ہے۔ ہر گھر میں حقہ ضرور ہوتا ہے بدوی سماج کا بھی حقہ لازمی جزو ہے۔ ہندوستانی اور بدوی سماج کی بعض رسومات میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً شادی کے وقت قریبی عزیزوں کے مقابلے میں غیروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لڑکی والے رشتہ لے کر لڑکے والوں کے یہاں جاتے ہیں۔ شادی کے وقت تمام عزیز و اقربا کی دعوت کا اہتمام ہوتا ہے۔ ولادت کے بعد بچے کا عقیقہ یا منڈن ہوتا ہے جس میں بچے کے بال اتروائے جاتے ہیں۔ عرب میں موت کے وقت آہ و زاری کی جاتی تھی۔ جنازے کے ساتھ رشتہ دار ننگے پیر جاتے تھے۔ عورتیں بھی برہنہ سر بال کھولے ہوئے ساتھ ہوتی تھیں۔ میت کے غم میں سر بھی منڈواتی تھیں اور ایک رسم یہ بھی تھی کہ موت پر زیادہ رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے اجرت پر نوحہ کرنے والیاں یعنی نائحات بلائی جاتی تھیں۔ اسلام کے نزول کے بعد زمانۂ جاہلیت کی یہ رسمیں ختم ہو گئیں لیکن ہندوستانی سماج میں آج بھی رائج ہیں موت کے وقت بہت زیادہ روتے پیٹتے ہیں۔ ہندوستان میں انھیں "ردولی" کہا جاتا ہے۔ موت کے تیسرے دن، دسویں دن، بیسویں دن، چالیسویں دن، ایک سال بعد اعزہ و اقارب کی دعوتیں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی سماج اور بدوی سماج کے ہر شعبے میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں دیہات کے لوگ آج بھی وہی زندگی گزار رہے ہیں جو عرب بدوی گزارا کرتے تھے۔ اس مماثلت کا سبب کچھ تو قدرتی آب و ہوا کا نتیجہ ہے اور کچھ عرب و ہند کے قدیم تجارتی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات ہیں۔

ماخذ

1. مقدمہ تاریخ ابن خلدون، مترجم مولوی عبدالرحمن، لاہور-1909۔
2. آئینۂ عرب، مترجم مولوی محمد ہارون، لاہور-1904۔
3. تاریخ ملت عربی، از پروفیسر فلپ ہتی، مترجم سید ہاشمی فرید آبادی، علی گڑھ -1972۔
4. بلوغ الارب (جلد اول و دوم)، از محمود شکری آلوسی مترجم پیر محمد حسن، لاہور -1967۔
5. عربی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی، دہلی-1982۔
6. عرب و ہند عہد رسالت میں، قاضی اطہر مبارکپوری، دہلی-1965۔
7. عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، خورشید احمد فاروق، دہلی-1973۔
8. جزیرۃ العرب، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، لکھنؤ (دوسرا ایڈیشن)-1983۔
9. عرب اور اسلام، پروفیسر فلپ ہتی مترجم رفعت، دہلی-1959۔
10. آدیباسی تہذیب و ثقافت، عبدالباری، دہلی-1992۔
11. ہندوستانی گاؤں، شیاما چرن دوبے مترجم ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی، دہلی -1980۔
12. اسلام اور غیر اسلامی تہذیب، علامہ ابن تیمیہ مترجم مولوی شمس تبریز خاں، لکھنؤ-1974۔

پتہ:
Deptt. of Urdu, Delhi University, Delhi

افتخار الزماں

قومی یکجہتی اور اردو ذرائع ابلاغ

ہماری زبانیں، بولیاں اور ہماری عبادتوں کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن یہ اختلاف نہیں بلکہ ہماری تہذیبی رنگارنگی ہے۔ پنڈت نہرو کے لفظوں میں، ''کثرت میں وحدت اور رنگارنگی میں یک رنگی ہی ہندوستانیت ہے۔'' اور قومی یکجہتی کا سچا تصور اسی کثرت میں وحدت سے عبارت ہے۔ ہندوستان میں مختلف قوموں، ذاتوں، اور مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ آئے مگر یہ سب ہندوستانی ثقافت میں ایسے ضم ہو گئے کہ انھیں کوئی طاقت الگ نہیں کر سکی۔ بیرونی قوموں کے ساتھ نئے رسوم و رواج اور نئی تہذیبیں آئیں اور جو بھی یہاں سکونت پذیر ہوا وہ صرف ہندوستانی بنا۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا عقیدے سے رہا ہو۔ عہد مغلیہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کو جاننے کی رفتار کافی تیز ہو چکی تھی۔ اکبر نے تو ''صلح کل'' پر عمل کرتے ہوئے دو قوموں کو ملانے اور قریب لانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ یہاں تک کہ ہندو رانیوں سے شادیاں بھی کیں اور ان کی مذہبی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اکبر کے بعد کے مغل شہنشاہوں نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دور میں تو مذہبی رواداری اور انسان دوستی کو بہت زیادہ فروغ ملا۔ شہنشاہ، امرا، نوابین اور عوام سبھی مل کر ہولی، دیوالی اور دیگر مذہبی تقریبات میں حصہ لیتے۔ ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی غرض کے ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگوں کی قربانیاں شامل رہی ہیں۔ مگر آج صدیوں سے قائم باہمی اعتماد اور اتحاد کا ماحول پراگندہ ہو رہا ہے۔ برادرانہ تعلقات میں رخنہ ڈالے جا رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم مذہب کی صحیح تعلیم سے بھٹک گئے ہیں۔ چند افراد نے اپنے مفادات کے لیے عوام کو گمراہ کر دیا اور ہم نے یہ سوچنا بند کر دیا کہ ہم پہلے ہندوستانی ہیں بعد میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ۔ کاش! ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ ملک پہلے ہے اور ہم سب ملک کے لیے ہیں۔ ملک کا وقار ہمارا وقار ہے۔

جس طرح ملک کی آزادی کے وقت اردو ذرائع ابلاغ نے قومی یکجہتی اور محبت کا پیغام دیا۔ آج بھی اسی زبان کو قومی یکجہتی کے جذبے کو زیادہ استوار کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس زبان کو سمجھنے والے ملک کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو صحافت کی ابتدا بہت پہلے یعنی 1822 میں ''جام جہاں نما'' کی اشاعت کے ساتھ نکلنے سے ہوئی۔ اسی برس راجا رام موہن رائے نے فارسی میں ایک اخبار ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ 1948 میں شائع ہونے والے کل چھبیس اخباروں میں سے انیس اخبارات اردو میں شائع ہوتے تھے۔ باقاعدہ اخبارات کی اشاعت کا مرحلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اردو عوام کے درمیان رابطے کی زبان بن چکی تھی۔ صرف دہلی سے ہی 120 ایسے علمی اخبارات سپرد ڈاک کیے جاتے تھے جن کا مقصد انگریزی راج کے خلاف عوام کو متحد کرنا اور ان کے درمیان قومی جذبہ پیدا کرنا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اردوئے معلی'' کی ادارت کرتے تھے۔ جس میں انڈین نیشنل کانگریس کی حمد و کی تقریریں باقاعدہ شائع کی جاتی تھیں۔ اردو صحافت نے جدوجہد آزادی میں ہی نہیں بلکہ عوامی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بھی اہم رول ادا کیا۔ اس تحریک کے متعدد قد آور رہنما اردو صحافت ہی کے ذریعے پبلک لائف میں آئے۔ سرسید احمد خاں کی ادارت میں شائع ہونے والے ''سائنٹفک گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' میں قومی یکجہتی سے متعلق موضوعات کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ ملاپ، پرتاپ، تیج، اور دیگر متعدد اردو اخبارات نے جدوجہد آزادی میں برطانوی سامراج کے خلاف اہم رول ادا کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اگر برطانوی نظام کسی چیز سے خوف زدہ تھا تو وہ اردو صحافت ہی تھی اردو صحافت نے جہاں تحریک آزادی کے دوران عوام کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا وہیں آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو میں تقسیم وطن کے دل دہلا دینے والے واقعات کو درکنار کرتے ہوئے ہمیشہ سماجی ہم آہنگی کی جانب پیش پیش رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سماج کی رہنمائی کی۔ آج حالات بدل چکے ہیں اور اس بدلتے ہوئے تناظر میں اردو ذرائع ابلاغ کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے مزید جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے سیکڑوں سال کے مشترکہ کلچر کی اساس اتنی مضبوط ہے کہ اسے سیاسی بنیادوں پر پیدا کی ہوئی فرقہ پرستی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی سیاسی مفاد پرست ہندوستان کی سیکولر روایات اور مذہبی رواداری کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

مشترکہ کلچر کی تعمیر اور اس کی مخالفت یا تخریب کا دھارا ساتھ ساتھ بہتا رہا ہے۔ کبیر، سورداس، تلسی، نانک، اور چشتی کے ملک ہندوستان میں مذہبی سطح پر قومی یکجہتی کی جڑیں ہمیشہ سے بہت مضبوط رہی ہیں۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جہاں اپنے مذہبی بزرگوں سے متعلق اظہار عقیدت کیا ہے، وہیں دوسرے مذہبی پیشواؤں کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اپنے تہواروں میں دوسروں کو شریک کیا ہے تو دوسروں کے تہواروں میں خود بھی شریک ہوئے ہیں۔ اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کرائی ہے تو دوسروں کی عبادت گاہوں کو بھی تعمیر کروایا ہے اور اگر اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ہے تو دوسروں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کی ہے اس ملک میں صدیوں سے چلی آرہی قومی یکجہتی کی روایت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ ہمارے ملک ہندوستان کی وہ تہذیبی شناخت ہے جو ہمیشہ سے ہمارا قومی سرمایہ افتخار ہے۔ لہٰذا ہمیں صدق دل سے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ قومی یکجہتی، جس میں نہ مذہب کی تفریق ہی آڑے آتی ہے، اور نہ ذات برادری کا فرق، اس کی بنیاد محض محبت، رواداری، اور بقائے باہم پر ہے اگر اسی شناخت کو قائم رکھنا ہے تو ہمیں اردو ذرائع ابلاغ مزید موثر بنانا ہوگا۔ کیونکہ اردو اپنی وسعت، شگفتگی اور ہر دلعزیزی کے باعث یقیناً دوسری زبانوں پر سبقت لے جاتی ہے۔ دراصل ہر زبان کی ایک خاص تہذیب اور زبان کلچر کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب صحیح عکاسی یہی اردو زبان کرتی ہے۔ اسی اردو زبان نے پرجوش نعرے اور تازگی دینے والے گیت ہمیں دیے ہیں۔ انقلاب کے نعرے کے پیچھے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی کوئی تمیز نہ تھی۔

اردو ذرائع ابلاغ کو عوام اور حکومت کے درمیان رابطے کا کام کرنا ہوگا اور صحیح سمت کی طرف لوگوں کو موڑنا ہوگا۔ اگر اردو ذرائع ابلاغ اس کام کو کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا ملک اپنے اسلاف کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر سے حاصل کرسکتا ہے۔ حالانکہ اردو ذرائع ابلاغ نے ہمیشہ ہی قومی یکجہتی کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ذرائع ابلاغ کی طاقت کو سمجھیں اور اس کے ذریعے ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کریں۔ آج عالمی پیمانے پر جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی صحیح تصویر عوام کے سامنے لائیں اور قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے کارآمد قدم اٹھائیں۔ اردو ذرائع ابلاغ کی کوششوں سے نہ صرف عالمی منظرنامہ بدلے گا بلکہ گوناں گوں تبدیلیاں بھی رونما ہوں گی۔ اور قومی یکجہتی کے لیے جو نہایت ضروری ہے یعنی باہمی اعتماد اور بھروسہ، اس کو بھی تقویت ملے گی۔ لہٰذا آج قومی یکجہتی ہماری ضرورت ہی نہیں بلکہ وقت کا تقاضا بھی ہے۔ اور تاریخ کی دین بھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو قومی یکجہتی کے بارے میں ان کی مثبت سوچ کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''سب سے اہم چیز جذباتی ہم آہنگی ہے۔ ہمیں اپنے ملک کو عظیم بنانا ہے۔ طاقت کے لحاظ سے عظیم نہیں بلکہ خیالات، عمل، اور تہذیب کے لحاظ سے اسے طاقتور بنانا ہے تاکہ یہ قوم انسانیت کی خدمت کرسکے۔'' قومی یکجہتی کے فروغ و استحکام میں صحافت، پریس، پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا بڑا کارگر ہوتا۔ اس کی اہمیت سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ہاں فلم انڈسٹری بھی اپنی بے پناہ قوت کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ آج دنیا ایک ''عالمی گاؤں'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ناطے اردو ذرائع ابلاغ کو بھی اسی زاویۂ نگاہ سے برتنے کی ضرورت ہے۔ جذبۂ اتحاد سے قوم کی تعمیر ہوتی ہے۔ اور قومی یکجہتی کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا ایک دوسرے کے تئیں دوستانہ سلوک اور ذات پات کی سطح سے بلند ہونا بھی ہے کسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا، غصہ یا نفرت سیاسی، مذہبی منافرت، جارحانہ ذہنیت، لسانی گروہ بندی، فرقہ واریت، اکثریت و اقلیت کے حقوق میں مفاہمت کی سودے بازی یا جوڑ توڑ سے قومی یکجہتی کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ مختصر یہ کہ قومی یکجہتی کے معنی و مفہوم کی وضاحت کے لیے قومی سطح پر مفاد عامہ سے متعلق فکر اور ہم آہنگی کے اعمال کو فروغ دیا جائے اور اردو ذرائع ابلاغ اپنے ابتدائی زمانے سے ہی انھیں خطوط پر گامزن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انفارمیشن ٹکنالوجی اور خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے اس انقلاب آفریں دور میں قومی یکجہتی کے تصور کو اس کے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ سمجھنے کی سعی کی جائے قومی یکجہتی کے فروغ میں میڈیا کا رول بہت اہم ہے۔

آزاد ہندوستان میں میڈیا کی اس قوت کا اندازہ حکومتی سطح پر سب سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو کو ہوا تھا۔ اپنے دور اقتدار میں انھوں نے ایک ایسا عمدہ نظام وضع کیا جس میں پریس کو عوامی مفاد کے کسی بھی چھوٹے بڑے مسئلے پر حکومت سے جواب طلبی کی آزادی تھی۔ درحقیقت یہی وہ دور تھا جب ملک کی تعمیر میں میڈیا کے تمکنہ رول کا قوم پر انکشاف ہوا اور یہ حقیقت اجاگر ہوئی۔ کہ خواہ وہ معاشی عدم مساوات کا خاتمہ ہو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی ہو یا صحت و زراعت سے متعلق پروگراموں کی نشر و اشاعت، ان جملہ موضوعات سے عوام کی واقفیت صرف میڈیا یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ پنڈت نہرو نے اس مقصد کے حصول کے لیے قومی یکجہتی کونسل کی تشکیل کی۔ اس کونسل کا مقصد بلاتفریق مذہب وملت اور طبقہ وخطہ سارے ملک کی تعلیمی صورت حال، نظام صحت، بنیادی ڈھانچہ اور انتظام وانصرام پر غور وخوض کرنا ہے۔ میڈیا کی قوت پر پنڈت نہرو کے غیر معمولی یقین اور قومی یکجہتی کونسل کے قیام کے تاریخ ساز عمل کا ہی نتیجہ تھا کہ ہندوستان کا سرکاری میڈیا قومی یکجہتی کونسل کے مجموعی

مقاصد کی نشر واشاعت میں مصروف عمل ہے۔ خواہ وہ چیچک، ہیضہ، ٹی بی، پولیو، ڈینگو اور ایڈز جیسی مہلک بیماریاں ہوں یا زراعت کے سبز وسفید انقلاب ہوں، ملک کی تعمیر میں عوامی حصہ داری ہو یا مختلف مذاہب کے رسم ورواج کو عام کرنا ہو۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعے ملک کے دوردراز علاقوں تک قومی یکجہتی کے حوالے سے مختلف پروگرام تیار کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔ جہاں تک بڑے شہروں کو تفریح فراہم کرنے والے ایف۔ایم۔ چینلوں کا سوال ہے یہ چینل سامعین کو تفریحی پروگرام پیش کرنے کے علاوہ قومی یکجہتی کے جذبے کو بھی فروغ دینے میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس سمت میں اگر وزارت برائے اطلاعات ونشریات کے پاس میڈیا اور قومی یکجہتی کے حوالے سے کوئی واضح لائحہ عمل طے ہو تو اس کام کو اور بھی موثر طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اردو ذرائع ابلاغ نے ضرور اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاہے وہ اخبارات ورسائل ہوں یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن یا پھر اردو کے دیگر پروگرام ہوں۔ اردو ذرائع ابلاغ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے کم وبیش تمام اہم مسائل پر تفصیل کے ساتھ عوام کو معلومات فراہم کی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اردو ذرائع ابلاغ نے ہمیشہ ہی عوامی شعور کو بیدار کرنے میں کارنمایاں انجام دیا ہے اور اس سلسلے میں قومی سطح کے اخبارات ورسائل خصوصی طور پر قابل تحسین ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ذرائع ابلاغ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے تعلق سے حقیقت کو سامنے لائیں اور اہم موضوعات پر مضامین قلم بند کریں۔ چاہے وہ مضامین کی شکل میں ہوں یا فیچر کی شکل میں مستقل شائع کرتے رہیں اور بہت حد تک ہمارے اردو روزناموں کے ایڈیٹر اس کام کو بحسن وخوبی انجام بھی دے رہے ہیں۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ ایک Powerfull Medium کے طور پر ابھر کر سامنے آرہا ہے۔ تو کیوں نہ ہم اس کے ذریعے قومی یکجہتی کے پیغام کو عام کریں اور کسی حد تک یہ کام ہو بھی رہا ہے۔ جمہوریت میں میڈیا کو Watch Dog کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی ذمے داری ہے کہ وہ عام لوگوں کو صحیح راستہ دکھائے۔ برائی اور اچھائی کی تمیز سکھائے۔ ملک اور قوم کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ میڈیا کو بھی خود احتسابی پر عمل کرنا ہوگا۔ میڈیا پر سنسر کسی طرح کی پابندی لگانے کی ضرورت نہیں ہے آج بھی اردو اخباروں کا عمل ہندی اور انگریزی اخباروں کے مقابلے میں زیادہ مثبت ہے۔ جب کہ ہندی اور انگریزی ذرائع ابلاغ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں سب کچھ بھلا بیٹھے ہیں ضرورت ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے سماج کا ہر ذمہ دار شہری اور دانشور طبقہ آگے آئے، میڈیا خصوصاً اردو ذرائع ابلاغ مذہبی رواداری، قومی یکجہتی اور حب الوطنی کی عظیم روایات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ انھیں مزید آگے بڑھانے میں اہم اور موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
K-78/A, Ist Floor,
Batla House,
Okhla, New Delhi-25

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رو، دوس میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔
ان کی شاعری میں جو باغیانہ نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔
کلیات حسن نعیم میں ان کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کر دی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت -/185 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

وہاب قیصر

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ شعروادب، تقریر و تحریر، انشا پردازی و مکتوب نگاری، لسانیات، لغات، اصطلاحات اور ترجمہ، صحافت اور سائنس، تاریخ و جغرافیہ، ہیئت و منطق، مذہب و فلسفہ، تفسیر، حدیث و فقہ سیاسی قیادت اور تعلیم و ثقافت، کون سا میدان ایسا ہے جس میں انھوں نے امتیاز حاصل نہ کیا ہو۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی تعلیمی و تنظیمی خدمات کو آج بھی سارے ملک میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نوے سال کی جدوجہد آزادی کے بعد ستمبر 1946 میں جب ملک میں عبوری حکومت قائم ہوئی تو ابتدا میں مولانا آزاد اس میں شریک نہیں تھے۔ پنڈت نہرو کے اصرار پر جنوری 1947 میں وہ حکومت میں شامل ہوئے اور مہاتما گاندھی کے مشورے پر انھوں نے وزیر تعلیم کی ذمہ داری سنبھال لی۔ بعد میں سائنس اور کلچر کی ذمہ داری ان کو تفویض کی گئی۔ 1952 کے پہلے عام انتخابات کے بعد مولانا آزاد کو تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات کا قلمدان سونپا گیا۔ 1957 کے دوسرے عام انتخابات کے بعد انھوں نے دوبارہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت کا قلم دان سنبھالا، جس پر وہ 22 فروری 1958 کو اپنی وفات تک برقرار رہے۔

ملک کی آزادی کے فوراً بعد گاندھی جی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور ان کی شہادت کے دو سال بعد سردار پٹیل بھی چل بسے۔ چنانچہ ملک کے پہلے وزیر اعظم کو نئی تعمیر اور ترقیاتی منصوبوں کی تدوین اور ان کی تکمیل کے لیے اور قوانین و ضوابط کی ترتیب میں مولانا آزاد کے مشوروں کی ہمیشہ ضرورت رہی۔ مولانا پارلیمنٹ میں پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے اور پنڈت نہرو کے مشیر خاص۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے نوجوانوں کی تعلیمی و تربیتی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوئے ملک کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کیا۔ انھوں نے تعلیم کو قومی فلاح کے حصول میں، متوازن ذہنوں کی پیداوار میں اور ملک میں باہمی اتحاد و اتفاق قائم کرنے میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ مولانا نے اپنے تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے وزارت تعلیم کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر ہمایوں کبیر اور خواجہ غلام السیدین جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کیں۔ ملک میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا تھا

''ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کو اعلیٰ ترین ترجیح حاصل ہونی چاہیے اور اس کا درجہ خوراک اور پوشاک کے فوراً بعد آنا چاہیے۔'' مولانا کا خیال تھا کہ پنج سالہ منصوبہ سازی کا مقصد صرف زرعی پیداوار، صنعت و حرفت، بجلی، ذرائع آمدورفت اور دوسرے زمروں میں ترقی کرنا ہی نہیں بلکہ اس میں یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اہل ملک اور نئی نسل کی ذہنی تربیت صحیح طور پر ہو یہی وجہ تھی کہ مولانا کی وزارت کے زمانے میں مرکزی تعلیمی بجٹ جو صرف دو کروڑ روپے تھا، 1958 میں بڑھ کر تیس کروڑ ہو گیا۔

مولانا آزاد کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ فنی تعلیم کے بغیر ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہو سکتی۔ معاشی ترقی کی رفتار میں اضافے کے لیے فنی تعلیم میں توسیع بے حد ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس بات پر مستقل نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہماری آئندہ ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے فنی ماہرین کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ملک کی جامعات، فنی اداروں اور صنعتوں میں ایک مناسب رابطے کی ضرورت کو ناگزیر قرار دیا۔ مولانا آزاد نے ان خیالات کا اظہار تعلیم سے متعلق اپنی بیشتر تقریروں میں کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے 1951 میں اپنے ایک خطاب میں فنی تعلیم سے متعلق اس طرح اظہار خیال کیا تھا:

''وزارت تعلیمات کی ذمے داری سنبھالتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ملک سے باہر جاتی ہے جو خود ملک میں تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور ہوں جب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہو جائے گی کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلیٰ سائنس اور فنی تعلیم و تربیت حاصل کریں۔''

مولانا آزاد نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے کئی ٹھوس قدم اٹھائے۔ ان میں کئی اداروں کا قیام شامل ہے جیسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، انڈین کونسل فار ایگریکلچرل اینڈ سائنٹفک ریسرچ، انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ اور انڈین کونسل آف سائنس ریسرچ وغیرہ۔ فنی تعلیم کے ملک میں تیزی سے فروغ کے لیے کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ CSIR جو ایک غیر فعال ادارہ

بن کر رہ گیا تھا، ان کو فعال بناتے ہوئے اس میں تحرک پیدا کیا اور اس کے تحت سائنسی تحقیقاتی اور فنی مہارت کے قومی اداروں کو قائم کیا۔ چنانچہ مولانا آزاد کے دور وزارت میں 12 قومی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس بنگلور کے دائرۂ کار کو وسعت دیتے ہوئے اس کو تیزی کے ساتھ ترقی کی سمت گامزن کیا۔ سابق میں حکومت ہند نے سارجنٹ رپورٹ کو تسلیم کرتے ہوئے 1945 میں نیشنل کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن قائم کی تھی تاکہ ملک میں فنی تعلیم کو فروغ حاصل ہو۔ 1953 میں اس کونسل کے دستور میں ترمیم کی گئی اور مولانا آزاد کو بحیثیت وزیر تعلیم اس کا صدر مقرر کیا گیا جس پر انھوں نے اس کونسل کی تنظیم جدید کی اور ملک میں فنی تعلیم کے اداروں کا ایک جال بچھا دیا۔

مولانا آزاد کے دور وزارت میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس ادارے میں ہوا بازی سے متعلق ایرو ناٹیکل انجینئرنگ، اندرونی احتراق سے متعلق Internal Combustion Engineering، خام دھاتوں کو صاف کرنے سے متعلق Metallurgy اور پاور انجینئرنگ کے شعبے بھی قائم کیے گئے تاکہ نوجوانوں کو ان میں تعلیم و تربیت کی سہولتیں مہیا کی جاسکیں۔ اس ادارے کا ایک اور مقصد یہ تھا کہ الکٹریکل انجینئرنگ کے گریجویشس کو برقی قوت کی تولید و ترسیل کی نہایت اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ ان سہولتوں کی فراہمی کے لیے درکار دو کروڑ روپئے کے خرچ کا انتظام ناممکن ہوتا اگر مولانا اس ادارے میں مسلسل دلچسپی نہ لیتے۔

حکومت ہند کی وزارت تعلیم 1947 کی ابتدا میں مولانا آزاد کی زیر سرپرستی Scientific Manpower Committee کا قیام عمل میں لائی جس کے ذمے یہ اندازہ لگانا تھا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق کے میدان میں 1947 سے 1957 تک ملک کو کتنے فنی عملے کی ضرورت پیش آئے گی اور اس کی بھرپائی کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جانی چاہئیں۔ اس کمیٹی نے ایک پنج سالہ منصوبے کی سفارش کی اور چند تجاویز پیش کیں۔ اہم تجاویز یہ تھیں:

1. ملک میں موجود پالی ٹیکنکس میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام۔
2. موجودہ فنی اداروں میں حسب گنجائش تعلیم و تحقیق کے امور میں توسیع۔
3. فنی عملے کے نگراں کاروں کا صنعت و حرفت کے ساتھ اشتراک۔
4. منتخب اداروں میں منطقہ داری اساس پر پروڈکشن انجینئرنگ اور ڈیزائن انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے سہولتوں کی فراہمی۔
5. فنی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے تعلیم کے اختتام پر عملی تعلیم و تربیت کے حصول کا انتظام۔

مولانا آزاد اپنے دور وزارت میں راہ کی مشکلوں، مالیہ کے فقدان، موزوں اشخاص کی کمی، ساز و سامان اور عمارتوں کی قلت کے باوجود فنی تعلیم کی توسیع کے لیے کوشاں رہے۔ فنی تعلیم کے فروغ کے معاملے میں وہ ہر قسم کی مدد کے لیے تیار رہتے، چاہے وہ بلڈنگ کی توسیع کی شکل میں ہو یا مشینوں کے منگوانے کی شکل میں۔ فنی تعلیم کے ماہر اساتذہ کی بھرتی کرنے کے معاملے میں انھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس سلسلے میں وہ مقامی ارباب اقتدار کی ہر ممکنہ مدد کیا کرتے تھے۔

مولانا آزاد اپنی تقریروں میں سننے والوں میں اس امر کا شعور پیدا کیا کرتے کہ تعلیم ہی منصوبہ بندی کی کامیابی کی اساس ہے اور فنی تعلیم کو ہر سطح پر رائج کیے بغیر نہ ملک میں صنعتی ترقی ہوسکتی ہے اور نہ اس کو برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ 1950 میں Central Advisory Board of Education کے اجلاس میں مولانا آزاد نے اپنے خطاب میں کہا تھا:

''فنی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے جو لائحہ عمل ہمارے پیش نظر تھا وہ چار اعلیٰ حرفتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کا استحکام تھا۔ مالیہ نے اجازت نہیں دی کہ ہم چاروں کا ایک ساتھ قیام عمل میں لائیں، لیکن ہم نے سوچا کہ کام کی ابتدا تو کی جانی ضروری ہے، اس لیے ضروری عمارتوں کی تعمیر کا انتظار کیے بغیر کلکتہ کے قریب شرقی اعلیٰ حرفتی ادارہ قائم کیا گیا۔ ابھی کام ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ تعلیمی سال میں ہم اساتذہ و طلبہ کے پہلے گروہ کو اس ادارے میں کام کرتا پائیں گے۔ ساتھ ساتھ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ موجودہ اداروں کی حالت کو بہتر بنائیں اور ان کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔''

اسی طرح فنی تعلیم و تربیت کے لیے مولانا آزاد کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے 1951 میں کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کے قیام کو عملی شکل دی جس نے بعد میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (IIT) کھڑک پور کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ 1950 میں حکومت بنگال نے اس صنعتی ادارے کی تعمیر کے لیے کھڑک پور میں ہجلی کے قریب وزارت تعلیمات کو بارہ سو ایکڑ زمین پیش کی۔ اس ادارے کی ابتدا دو سو طالب علموں کے داخلے سے ہوئی جنھیں تین ہزار درخواست گزاروں میں سے چنا گیا تھا۔ یہ ادارہ ایک سال کے عرصے میں مزید ترقی کی طرف گامزن ہوا۔ یہ ادارہ بے سروسامانی کی حالت میں شروع ہوا اور کم سے کم وقت میں تکمیل کو پہنچا۔ کامیاب طلبہ کا پہلا بیچ جولائی 1955 میں نکلا۔ یہاں سے نکلنے والے ہر فارغ التحصیل کے ہاتھ میں ملازمتوں کے تین تین آرڈرس تھے۔

1956 میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کھڑک پور کا نظام العمل، مولانا آزاد کی راست نگرانی میں وضع کیا گیا جس کی رو سے اس کو قومی اہمیت کا

ایک ادارہ قرار دیا گیا۔ اس ادارے کو مجاز گردانا گیا کہ وہ ڈگری، ڈپلوما اور دوسرے علمی، انتظامی اور مالی معاملات پر پورا پورا اختیار رکھے۔ اس ادارے میں تعلیمی نصاب کی ترتیب میں بھی جدت سے کام لیا گیا۔ مولانا آزاد نے محسوس کیا تھا کہ قدیم طرز کی انجینئرنگ کی تعلیم جس میں ٹیکنالوجی پر خاص طور پر زور دیا جاتا رہا ہے وقت کے ساتھ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر ہے۔ ان کے خیال میں جدید ہندوستان کو ایسے انجینئروں کی ضرورت تھی جو صرف فن داں نہ ہو بلکہ قومی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہوں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس کی تیاری میں کوشش اس بات کی گئی کہ بنیادی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے ساتھ ادبی علوم کی بھی تعلیم دی جائے۔ ادارے کے کام کا ایک خاص پہلو جس کو ہندوستان کے بیشتر کاروباری منتظمین اور انجینئروں نے پسند کیا وہ یہ تھا کہ یہاں کاروباری بندوبست، صنعتی انتظام، کثیر مقدار میں پیداوار کے جدید طریقوں پر قلیل مدت کے نصاب کی تعلیم بھی دی جاتی رہی۔ دست کار اور داثر مین کی سندوں سے لے کر فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی میں پی ایچ ڈی اور ڈی ایس سی کی اعلیٰ ڈگریوں کے حصول تک کا انتظام کیا گیا تھا۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کھڑک پور میں انجینئرنگ کے بنیادی کورسوں میں داخلوں کے ساتھ سیول آرکٹکچر، اگریکلچرل انجینئرنگ اور آرکٹکچر کی ڈگریوں کے لیے بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ پروڈکشن انجینئرنگ Combustion Engineering میں پوسٹ گریجویشن کورس بھی یہاں شروع کیے گئے۔ چند طلبہ نے انجینئرنگ کے کئی میدانوں میں تحقیق کی غرض سے داخلہ لیا۔ اس ادارے نے Management Studies میں مختصر مدتی کورس بھی شروع کیا جو ان دنوں سارے ایشیا میں اپنی نوعیت کا واحد کورس تھا۔ اس کورس میں صنعت، کامرس، سرکاری محکموں اور دوسرے اداروں سے وابستہ لوگوں نے داخلہ لیا اور موثر ایڈمنسٹریشن کے مشترکہ اصولوں کی جانکاری حاصل کی۔ اس ادارے میں طلبہ کی جملہ تعداد بڑھ کر سات سو ہو چکی تھی اور مزید ایک سال بعد ایک ہزار طلبہ نے اس میں داخلہ لیا تھا۔ اس طرح مولانا آزاد کے دور وزارت میں ہی یہ چھوٹا سا ادارہ ایک بہت بڑے ادارے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

جدید ہندوستان میں 1947 سے 1957 تک فنی تعلیم کی سہولتوں اور ان سے استفادہ کنندگان کا جائزہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مولانا آزاد کے دور وزارت میں فنی تعلیم کے ارتقا کی صورت حال کیا تھی۔ سال 1947، 1950 اور 1955 میں ترتیب وار 28، 37 اور 43 انجینئرنگ کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے جن سے فارغ التحصیل ہونے والے گریجویٹس کی تعداد 950، 1700 اور 3000 تھی۔ اسی طرح ان برسوں میں ٹیکنالوجی کے تعلیمی و تربیتی اداروں کی تعداد 16، 24 اور 25 تھی جہاں سے کامیاب ہونے والے طلبہ کی تعداد 300، 500 اور 700 تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے (1961-1956) میں ریاستی اور مرکزی وزارت تعلیمات کے لیے فنی تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی منظورہ تجاویز کی عمل آوری کے لیے 57 کروڑ 37 لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تھی تاکہ آئی آئی ٹی کھڑک پور، دہلی بامبے مدراس اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کی ترقی کے علاوہ 19 انجینئرنگ کالج، 71 پالی ٹکنک اور 60 چھوٹے فنی مدرسوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔

الغرض مولانا آزاد نے فنی تعلیم کے فروغ، استحکام اور ارتقا کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیے جدید ہندوستان کی تعمیر میں ان کا اہم حصہ ہے۔

□□□

پتہ:
MANUU, Gachibowli,
Hyderabad-500032 (A.P.)

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روزمرہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اسد فیض

ڈاکٹر وزیر آغا سے ایک مکالمہ

اردو نظم، انشائیہ نگاری اور تنقید میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ادبی کام اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ان کی ایک پہچان ان کا ادبی جریدہ "اوراق" بھی ہے جس کا اجرا انہوں نے 1966 میں کیا۔ اس جریدے نے کئی نسلوں کی ادبی تربیت کی ہے۔ گذشتہ دنوں ہم نے اردو ادب اور تحقیق کے مختلف موضوعات پر ان سے ایک مکالمے کا اہتمام کیا جو نذر قارئین ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب اردو میں آج جو تنقید لکھی جارہی ہے اس کے معیار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: اردو میں ایک تو جامعاتی سطح پر تنقید لکھی جارہی ہے جس کا معیار عام طور پر تسلی بخش نہیں پھر بھی بعض عمدہ مقالات ضرور سامنے آئے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔ جامعات کے علاوہ تقریباتی سطح کی تنقید بھی بہت لکھی گئی ہے۔ دونوں شعبوں کے حوالے سے جو تنقیدی مواد سامنے آیا ہے اس کا بیشتر حصہ چوں کہ اعلا پائے کا نہیں ہے لہٰذا یہ تاثر عام ہوا ہے کہ پوری اردو تنقید روبہ زوال ہے حالانکہ کئی ناقدین نے اعلا پائے کا کام کیا ہے۔ اس کام کا کچھ حصہ نظری ہے اور باقی عملی تنقید کے زمرے میں آتا ہے۔ نظری تنقید کے حوالے سے ہمارے ناقدین نے تھیوری کے سلسلے میں مطالعہ تو بہت کیا ہے لیکن بدقسمتی سے تھیوری کی مین اسٹریم میں شامل نہیں ہو پائے۔ پھر بھی بعض ناقدین کے ہاں پیش رفت دکھائی دیتی ہے۔ جنھوں نے مغربی دانش اور مشرقی دانش کے درمیان پل بنائے اور لین دین کی فضا قائم کی ہے۔ عملی تنقید کے حوالے سے ہمارے ناقدین نے چاہے وہ ہندوستان کے ہوں یا پاکستان کے قابل قدر کام کیا ہے۔ بالخصوص نظم، غزل، افسانے اور انشائیے کے جو تجزیاتی مطالعے سپرد قلم کیے گئے ہیں ان کا معیار اعلیٰ ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اردو تنقید کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔

س: آپ کے خیال میں اس وقت صف اول کے ناقدین کون کون سے ہیں جن کا تنقیدی کام معیاری ہے؟

ج: زندہ ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، انور سدید اور وحید قریشی کے نام ذہن میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد معیاری تنقید لکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ نئی نسل میں رفیق سندیلوی اور ناصر عباس نیر نے بہت معیاری کام کیا ہے۔

س: ہندوستان کے دو ناقدین شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: ان دونوں حضرات نے تنقید کے حوالے سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پوسٹ ماڈرن ازم اور شمس الرحمٰن فاروقی نے جدیدیت کے فروغ میں قابل قدر کام کیا ہے۔ ان دونوں ناقدین کا مطالعہ وسیع ہے، دونوں اپنے دائرۂ کار میں اہمیت کے حامل ہیں۔

س: آپ کا اپنا تنقیدی نظریہ کیا ہے؟

ج: ذاتی طور پر امتزاجی تنقید کا حامی ہوں۔ پچھلے ایک برس کے دوران میں مختلف نظریوں کی حامل تنقید کا رواج رہا ہے۔ مثلاً نفسیاتی، اسطوری، مارکسی، وجودی، ساختیاتی اور پس ساختیاتی تنقید کی آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ امتزاجی تنقید جو اصلاً تحریک تنقید ہے، کسی بھی تنقیدی مکتب کو مسترد نہیں کرتی۔ یہ صرف اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ فقط ایک نظریے یا تحریک کی حامل تنقید، تخلیق کے محض ایک پہلو پر خود کو مرتکز کر کے تخلیق کے دیگر ابعاد سے روگردانی کی مرتکب ہوتی ہے۔ تاہم امتزاجی تنقید محض مختلف تنقیدی تھیوریوں کی حاصل جمع کا نام نہیں، یہ اس حاصل جمع سے کچھ زیادہ ہے اور یہ کچھ زیادہ ہونا اس کا تخلیقی پہلو ہے۔ امتزاجی تنقید متن کو از سر نو تخلیق کرتی ہے اور ضرورت کے مطابق ان تنقیدی نظریات سے استفادہ کرتی ہے جن کی طلب خود متن کے اندر موجود ہوتی ہے۔ یوں یہ تنقید، تخلیقی ادب کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے۔

س: آپ کی تنقید میں تمثیل آفرینی کی ایک روش موجود ہے جس سے آپ معانی کی ترسیل اور تفہیم کا کام لیتے ہیں۔ کیا یہ عمل لاشعوری طور پر ہوتا ہے؟

ج: جی ہاں! یہ عمل، لاشعوری طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یعنی تمثیل غیب سے آتی ہے اور مشکل سے مشکل تعقلات کے مخفی پہلوؤں کو آئینہ دیتی ہے۔ جب میں نے ساٹھ کی دھائی میں ''اردو شاعری کا مزاج'' لکھی تھی تو گیت، غزل اور نظم کے مزاج کو سمجھنے کے لیے، ''ماں اور بچے'' کی تمثیل نے میری رہنمائی کی تھی۔ جہاں کہیں مجھے ان اصناف شعر کے حوالے سے کوئی رکاوٹ محسوس ہوتی یہ تمثیل مجھے مشکلات سے نکلنے میں مدد دیتی۔ مثلاً گیت کے حوالے سے مجھے اس تمثیل نے سمجھایا کہ گیت اس عورت کی طرح ہے کہ بدن میں اس کا محبوب (شوہر) اپنی شبیہ چھوڑ کر کسی دور دیس چلا گیا ہے۔ اب یہ عورت ایک تو اپنے محبوب کی یاد کو اپنے دل میں پالتی پوستی ہے اور دوسری طرف اپنے محبوب کی شبیہ کو بدن میں چھپائے اسے مادی سطح پر اپنے قریب محسوس کرتی ہے لہٰذا اس کا پورا وجود گیت میں ڈھل کر پتی پوجا کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ غزل میں بچہ جنم لے کر ماں کے ساتھ ایک نئے رشتے میں منسلک ہو جاتا ہے۔ وہ ماں کی انگلی تھام کر چلتا ہے اور کبھی کبھی انگلی چھڑا کر آزادہ روی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے مگر بھرے بھرے میلے میں گم ہو جانے کے ڈر سے

واپس آکر اپنی ماں کی انگلی تھام لیتا ہے۔ غزل میں یہی کچھ تو ہوتا ہے کہ اس کا ہر شعر غزل سے الگ ہوکر اپنی مطلق العنانی اور انفرادیت کا مظاہرہ کرتا ہے مگر پھر پلٹ کر غزل کے ردیف قافیے سے منسلک ہو جاتا ہے۔ نظم میں صورت حال بدلتی ہے کہ اب مرد کی سائیکی میں عورت، گریٹ مدر کے روپ میں نمودار ہو جاتی ہے گویا ماں، مرد کے وجود کے اندر فعال ہو جاتی ہے۔ اس ماں کا ایک اہم روپ لاشعور ہے جو نظم کو راستہ دکھاتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ماں اور بچے کی تمثیل نے ان اصناف شعر کے مزاج کو سمجھنے کے لیے میری کس طرح رہنمائی کی۔

س: علامت آپ کے نزدیک کیا ہے؟ اس کی کیسے وضاحت کریں گے؟

ج: علامتی انداز معنی آفرینی کی ایک صورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ علامت کا معنیاتی نظام کس طرح متحرک ہوکر وسعت آشنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی ایک تمثیل ہی نے میری مدد کی تھی جو کچھ یوں ہے۔ فرض کیجیے کہ رات اندھیری ہے اور میدان میں فقط ایک قمقمہ روشن ہے اور آپ اس قمقمے کی طرف جا رہے ہیں تو جسم سے چمٹا ہوا آپ کا سایہ آپ کا تعاقب کرتے ہوئے قدم بہ قدم قد میں چھوٹا ہوتا چلا جائے گا حتیٰ کہ آپ قمقمے کے نیچے جا کھڑے ہوں گے تو سایہ آپ کے قدموں میں سمٹ کر غائب ہو جائے گا مگر جب آپ قمقمے سے آگے بڑھیں گے تو یہی سایہ آپ کے قدموں سے برآمد ہوکر آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا اور یہ بتدریج بڑا ہوتا چلا جائے گا تا آنکہ اندھیرے میں جذب ہوکر معدوم نہ ہو جائے۔ علامت کی کارکردگی کو سمجھنے کے لیے یہ تمثیل بہت موزوں ہے۔ ہر شے کے ساتھ اس کے معنی منسلک ہوتے ہیں اور شے کے عقب میں ایک غلام کی طرح چلتے ہیں مگر جب شے مکمل روشنی میں (اور یہ روشنی شعور کی ہے) آ جاتی ہے تو سایہ (معنی) شے کے قدموں میں سمٹ جاتا ہے گویا شے اور اس کے معنی ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ نشان کی واضح ترین صورت ہے مگر اس کے بعد جب شے آگے بڑھتی ہے تو اس کا سایہ (معنی) اب دلیر ہوکر اس کے آگے آگے چلنے لگتا ہے گویا پہلے جو ایک دست بستہ غلام تھا وہ اب علم بردار ہے۔ اب اس کی حیثیت نشان کی نہیں علامت کی ہے جو متعین معنی کے زنداں سے نکل کر معنیاتی توسیع کی حامل بن جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ جب شے ایک معنی کی حامل ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ ''نشان'' ہے جب یہ شے ایک اور شے سے مشابہت کی بنا پر رشتہ قائم کرے تو یہ تشبیہ یا استعارہ ہے اور جب یہ شے آگے بڑھ کر معنیاتی سطح کی حامل علم بردار بن جائے تو علامت ہے۔

س: جامعات کی سطح پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: جامعات کی سطح پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے، اس سے اکثر لوگ مطمئن نہیں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر کسی بھی موضوع پر پہلے سے تحقیق شدہ مواد کو اقتباسات کی مدد سے یک جا کر دیتے ہیں اور اپنی طرف سے کوئی نیا انکشاف نہیں کرتے ہیں۔ تحقیق محض گرد آلود مخطوطوں کو جھاڑ پھونک کر پیش کرنے کا نام نہیں۔ تحقیق کو بہرحال تنقید کی اساس پر استوار ہونا چاہیے یعنی اگر کوئی قدیم مخطوطہ ادبی اعتبار سے معیاری ہے یا تاریخی تسلسل ہی کسی بڑے شگاف کو پر کر رہا ہے تو اسے نشان زد کرنے کا جواز ہے لیکن اگر اس کا واحد وصف کرم خوردہ ہونا ہے تو پھر یہ کار عبث ہے۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ جامعات کی سطح کا تمام کام غیر معیاری ہے۔ یہ بات مستثنیات کے تابع ہے۔ یہاں وہاں عمدہ چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔

س: آپ کی رائے میں کیا جامعات میں زندہ ادبی شخصیات کے کام پر ڈاکٹریٹ کی سطح کا کام ہونا چاہیے؟

ج: میری رائے میں ایسی ادبی شخصیات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جانا چاہیے جنھوں نے اپنی عمر عزیز کا ایک حصہ گزار لیا ہے اور جن کا ادبی کام، معیار کے حوالے سے اعلا پائے کا ہے۔ پچھتر اسّی برس کی عمر تک اکثر ادیب اپنا بہترین کام پیش کر چکے ہوتے ہیں لہٰذا اس عمر کے ادبا کی کارکردگی کو پی ایچ ڈی کے مقالے کے ذریعے زیر بحث لانا ضروری ہے۔

س: آپ جامعات کے تحقیقی مقالات کو جانچتے ہوئے کن امور کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

ج: میرے پاس زیادہ تر تنقیدی مقالات آتے ہیں، جب کوئی تحقیقی مقالہ آتا ہے تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ محقق نے کوئی نیا معیاری متن دریافت کیا ہے یا نہیں اور پھر یہ کہ اس نے متن کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے کہ نہیں اگر متن قابل قدر ہے اور اس سے تاریخ کا کوئی تاریک گوشہ منور ہوا ہے تو یہ اوریجنل کام ہے جو قابل تعریف ہے۔ اگر مقالے میں ایسا نہیں ہوا لیکن مقالہ نگار نے ایک نیا Synthesis پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مختلف متون باہم آمیز ہوکر ایک نئے زاویۂ نگاہ پر منتج ہوئے ہیں تو یہ بھی قابل قدر ہے۔ لیکن اگر محقق محض پیش پا افتادہ باتوں کو اقتباسات کی مدد سے جوڑ کر پیش کرتا ہے اور اپنی طرف سے کوئی نئی دریافت نہیں کرتا تو اس کا مقالہ غیر معیاری قرار پائے گا۔

س: آپ کی خود نوشت ''شام کی منڈیر سے'' بے حد پسند کی گئی؟ کیا آپ اس میں بعد کے واقعات کو شامل کرکے اسے مزید آگے بڑھائیں گے؟

ج: میں نے اپنی یہ خود نوشت سوانح عمری 1986 میں مکمل کی تھی اس وقت میری عمر چھیاسٹھ برس تھی۔ اس وقت مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ مجھے مزید بیس برس کی مہلت مل جائے گی۔ احباب نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ ان بیس برسوں کی کہانی بھی اپنی آپ بیتی میں شامل کروں۔ پہلے تو میں ٹالتا رہا پھر میں نے سوچا کہ اگر میں ان بیس برسوں کے واقعات اور سانحات کے اپنے اوپر مرتسم ہونے والے اثرات اور ان کے نتیجے میں اپنی ذات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ نہیں لوں گا تو میری آپ بیتی تشنہ رہ جائے گی۔ سو میں نے 2006 کے آغاز میں آپ بیتی کا باقی ماندہ حصہ مکمل کرنا شروع کیا اور دو تین ماہ

میں اسے مکمل کرلیا۔ اب یہ پوری آپ بیتی کتابی صورت میں جلد ہی اہل نظر کے سامنے آجائے گی۔

س: زندگی کیا ہے؟ اور اگر یہ دوبارہ ملے تو کیسے گزارنا پسند کریں گے؟

ج: زندگی کیا ہے یہ ایک ایسا ہی مشکل سوال ہے جیسا یہ کہ نیلاہٹ کیا ہے؟ آپ زیادہ سے زیادہ نیلاہٹ کے کسی مظہر کی طرف اشارہ کرکے اس کی نشان دہی کرسکتے ہیں۔ یہی حال زندگی کا ہے جو مائیکرو آرگن ازم سے لے کر انسان تک کروڑوں اربوں مظاہر کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ زندگی کی ابتدا اور اس کے ارتقا کے بارے میں نہیں پوچھ رہے، آپ زندگی اور اس کے جزرومد کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ گزارش ہے کہ عام زندگی، ایک نہایت پراسرار مظہر ہے مگر انسانی زندگی میں روح کی آمیزش اور ذہن رسا کی کارکردگی بھی شامل ہے اس لیے اس کی پراسراریت کا کوئی انت نہیں۔ یہ ایک نادرو نایاب تجربہ ہے جس کے ان گنت ابعاد ہیں اور جو مائیکرو (Micro) سے لے کر میکرو (Macro) تک پہنچے ہوئے ہیں۔ احساس، مزاج، جمالیاتی حظ، فکری جہت اور روحانی بالیدگی اس کے خاص الخاص وظائف ہیں۔ آپ نے پوچھا ہے کہ اگر زندگی دوبارہ ملے تو کیسے گزارنا پسند کروں گا۔ بات یہ ہے کہ کوئی بھی شخص محض ایک ہی وضع کی صورت حال کو پسند نہیں کرتا۔ میں ذاتی طور پر زندگی کو خوش آمدید کہنے پر مائل ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ تکرار مسلسل کی گرویدہ نہیں، وہ ہر قدم پر تغیر و تبدل کا مظاہرہ کرتی ہے۔ "کیسے گزارنا" میرے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ البتہ اس نادرو نایاب تجربے سے دوبارہ گزرنا بجائے خود ایک بہت بڑا انعام ہے۔

س: ہمارے ہاں مطالعے کی عادت معاشرتی سطح پر ہی نہیں، تدریسی سطح پر بھی کم زور پڑ رہی ہے اس کی کیا وجوہ ہیں؟

ج: مادی آسائشوں کے حصول نے معاشرے کی ترجیحات بدل دی ہیں۔ ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بھی وسیع مطالعے کی عادت ختم ہوتی نظر آتی ہے، نہ تو اساتذہ پورے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے ہیں۔ (یہ بات مستثنیات کے تابع ضرور ہے) اور نہ ہی طلبہ کو اب مطالعے کا شوق ہے۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری کے زمانے میں گورنمنٹ کالج سرگودھا کی لائبریری سے بے حد متاثر ہوا لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوا کہ موجود کتابوں میں سے کوئی بھی 1947 کے بعد جاری نہیں کرائی گئی تھی۔ اس زمانے میں اردو زبان میں لکھی گئی کتب ایک ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی تھیں۔ اب یہ بہ مشکل اڑھائی تین سو یا پانچ سو کی تعداد میں چھپتی ہیں اور ان میں سے بھی زیادہ تر احباب میں تقسیم ہوجاتی ہیں۔ ہماری نئی پود کا رجحان اب کتب بینی کی بجائے چینل بینی کی طرف ہے۔ کتب بینی کا رجحان گھر سے شروع ہوتا ہے اب گھروں میں کتاب کلچر بتدریج ختم ہورہا ہے لائبریریوں میں جانے کا رجحان بھی کم زور پڑ رہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ والدین اور اساتذہ بھی بچوں میں نصاب سے ہٹ کر مطالعہ کرنے کے رجحان کو فروغ بخشنے کی طرف راغب نہیں رہے۔

س: یہ بتائیے کہ آپ ادب میں کس حیثیت سے زندہ رہنا پسند کریں گے، ایک شاعر کے طور پر یا نقاد کی حیثیت سے؟

ج: اس میں انشائیہ نگاری کو بھی شامل کرسکتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ان تینوں اصناف کے حوالے سے خاصا کام کیا ہے اور مجھے یہ تینوں اصناف بے حد عزیز ہیں۔ میں ان تینوں میں موجود ہوں۔ بہت عرصہ ہوا میں نے میڈم کو آن کی لکھی ہوئی ایک چینی نظم کا اردو ترجمہ کیا تھا جو اس نے اپنے خاوند کے نام اس وقت لکھی تھی جب وہ کسی اور عورت کی طرف راغب ہوگیا تھا۔ نظم یہ تھی۔

آج میرے اور تیرے درمیاں
بعد کیسا فاصلہ باقی کہاں
لے ذرا مٹی کی اک چکنی ڈلی
ڈال پانی، گوندھ اس کو زور سے
اور بنا دو بت، حسین والا جواب
ایک بت کی شکل ہو تیری طرح
دوسرا بت ہو مرا
بت شکن بن کر انھیں اب توڑ دے
ڈال پانی، گوندھ ان کو پھر ذرا
اب بنا پھر دونوں بت
ایک اپنا، اک مرا
اب مرے بت میں ہے کچھ تیرا وجود
اور ترے بت میں ہے کچھ پیکر مرا
زندگی کی کون سی طاقت بتا
تجھ کو کرسکتی ہے اب مجھ سے جدا

یہی حال میرا ہے۔ میں ان تینوں اصناف میں اس طرح جذب ہوچکا ہوں کہ اگر مجھے ادبی طور پر رہنا ہے تو اس تثلیث کے حوالے سے نہ کہ ان میں سے فقط ایک صنف کے حوالے سے۔

س: آج کل کیا لکھ رہے ہیں اور کیا آپ کسی مزید ادبی منصوبے پر بھی کام کرنا چاہتے ہیں؟

ج: شوق کی بلندی تو بدستور ہے مگر ہمتوں کی پستی نے پوری طرح دبوچ لیا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہوں۔ پڑھنا بھی جاری ہے اور لکھنا بھی۔ لکھنے کے حوالے سے یہ ہے کہ نثر بہت کم لکھتا ہوں۔ البتہ نظم کی آمد کا سلسلہ جاری ہے۔ پچھلے بارہ چودہ سال کے دوران میری اردو نظموں کے چھ مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پنجابی شاعری کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اب اس پیرانہ سالی میں کسی منصوبے کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

رابعہ سرفراز

روزگار کے مسائل اور اردو کا مستقبل

اگر امیر خسرو سے منسوب اردو شاعری کے ابتدائی نمونوں سے اردو زبان و ادب کی قدامت کا اندازہ لگائیں تو یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ اردو نے اب تک کم وبیش سات صدیوں کا سفر طے کرلیا ہے۔ گذشتہ اڑھائی تین صدیوں سے تو اس زبان میں نثر اور نظم کی ان کتابوں کا سراغ بھی تسلسل سے نظر آتا ہے جو تحقیق اور دقت کی ہر کسوٹی پر پورا اترتی ہیں اور جو اردو زبان و ادب کا ایسا زندہ سرمایہ ہیں جن کی توثیق ہر آنے والے زمانے نے کی ہے۔ صدیوں پر محیط اس ارتقائی سفر میں اردو نے تخلیق، تنقید اور تحقیق سے لے کے اظہار و اسلوب اور تشریح و تفسیر کے حوالے سے باکمال خدمات انجام دی ہیں۔ عہد بہ عہد معاشرے میں اس کی ضرورت و اہمیت بڑھی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں رابطے کی زبانوں کے گراف میں اس کا کام، نام اور مقام اونچا ہے۔ ابلاغیات کی موجودہ صورتحال میں اس خطے میں اردو کی اہمیت نہ صرف یہ کہ نمایاں ہے بلکہ اس میں ترقی روز افزوں ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں سے لے کے اخبارات و رسائل کی اشاعت تک میں اس کا مکمل عمل دخل نمایاں اور مؤثر ہے۔ رابطے کی زبان کے طور پر (Langua Franca) اردو ہی واحد زبان ہے جو متعدد جغرافیائی اکائیوں، علاقائی حوالوں، لسانی شناختوں اور مختلف تہذیبی وحدتوں کو ایک متحرک، زندہ اور روز افزوں نسبت میں پروئے ہوئے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کا یہ کردار اس کی اپنی قوت نمو اور داخلی قوت اور اہمیت کے اعتبار سے ہے۔ سرکاری سطح پر اس کی وہ پذیرائی نہیں جو اس کا آئینی اور جائز حق ہے تاہم اپنی لسانی خصوصیات، مزاج اور اہمیت کے سبب اسے (Langua Franca) کا درجہ حاصل ہے۔

Langua Franca کی بھی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک عمومی حیثیت جس میں عوام الناس اسے بول چال میں برتتے ہیں۔ لب و لہجہ کے فرق اور غلط سلط تلفظ کے ساتھ ہی سہی اس زبان کے خدوخال اور خارجی چہرہ کسی نہ کسی طور برقرار رہتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور سرکار دربار کی توجہ اور تعاون کے بغیر یہ اپنا کام جاری رکھتی ہے۔ معاشرے میں اس کا مکمل دخل برقرار رہتا ہے۔ اس کی دوسری حیثیت اس زبان سے خاص نسبت رکھنے والے اہل علم کی ہوتی ہے جو اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق و تنقید کرتے ہیں۔ اس کی جڑوں سے لے کے اس کے امکانات تک پھیلے ہوئے معاملات و مسائل پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔ اس کے تلفظ، قواعد و اسالیب کو زیر بحث لاکر اس کی تہذیب کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یہ خاص طبقہ جو کسی زبان کی جداگانہ شناخت اور ترقی کا باعث ہوتا ہے اس زبان کے اہل دانش ہوتے ہیں۔ گذشتہ صدی میں اردو کے حوالے سے یہ فریضہ زیادہ تر اساتذہ نے نبھایا۔ ول ڈیوراں کا کہنا ہے کہ استادوں (Educationists) کو یہ (Credit) تو بہرحال جاتا ہے کہ انھوں نے ہر زمانے میں کسی نہ کسی طور علم کو زندہ اور اس کی ترسیل کو بحال رکھا۔ اردو کی حد تک یہ بات بہت درست معلوم ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی میں سینکڑوں اساتذہ ہیں جنھوں نے تنقید و تحقیق کے باب میں یہ فریضہ انجام دیا (تخلیق کی بات اس سے کچھ مختلف ہے) مولوی شفیع، حافظ محمود شیرانی، حکیم الدین احمد، سید اشتشام حسین، آل احمد سرور، رشید حسن خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ، غلام مصطفےٰ خاں، سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری..... ایک طویل فہرست ان ناقدین، محققین اور ریسرچ سکالرز کی ہے جو زندگی کے کسی نہ کسی حصے بلکہ اکثر عمر بھر درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ اور ڈاکٹر وزیر آغا جیسی شخصیات کتنی ہیں جو اپنے طور پر تحقیق و تنقید کے کاموں سے وابستہ رہے! گذشتہ صدی میں اردو زبان و ادب کی درس و تدریس کی جو صورت حال تھی کیا آئندہ بھی ویسی رہے گی اور کیا آئندہ جامعات سے وابستہ افراد تنقید و تحقیق کے اس معیار کو قائم رکھ سکیں گے جو معیار ان فاضل اساتذہ کے نتائج فکر اور تلاش و تحقیق نے اردو زبان و ادب کو دیا۔۔۔ میری دانست میں جب تک اس بارے میں کوئی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں ہوگی آئندہ ہماری جامعات ان معیارات سے دور رہیں گی۔ آج کا تدریسی منظرنامہ گذشتہ صدی تو کیا گذشتہ ربع صدی سے قطعی مختلف ہے۔ جب سے زندگی اور معاشرتی قدروں کو روپیہ پیسہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ تحصیل و تدریس اور علم کے رویے بھی بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔

موجودہ منظرنامے میں اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تیزی سے بدلتے معاشرے میں نئے تقاضوں اور مطالبات کے سامنے یہ زبان کیا کردار ادا کرسکتی ہے۔ نیز روز بروز معاش سے کٹتی ہوئی اردو زبان کو مستقبل کے منظرنامہ میں بھی دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور دوسرے Job Oriented Subjects معاش سے وابستہ علوم و فنون کی طرح مستقبل کے معاشی خاکے میں اردو خواں طبقے کے لیے بھی کوئی بہتر مقام پیدا کرنے کی تجاویز پر تمام اردو کے اداروں کو غور و خوض کرنی چاہیے۔

کیا اردو کا موجودہ تدریسی نظام انہیں خطوط پر استوار ہے جن خطوط پر آج کی ترقی یافتہ زبانوں انگریزی، چینی، جاپانی وغیرہ کا تدریسی نظام ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زبانوں کا چلن بھی ہم سے مختلف ہے۔ ہمارا زیادہ زور زبانوں سے وابستہ شخصیات کے احوال و آثار اور ان سے وابستہ افکار و نظریات کے مطالعہ پر ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک میں زبانوں کی تدریس کا بڑا حصہ عملی زندگی میں ان کے ربط اور افادیت سے وابستہ ہے۔ ہمیں اپنی جامعات میں بڑی تیزی کے ساتھ بیسیوں ایسے نئے کورسز متعارف کرانے ہوں گے جو زبان و ادب کی آگہی کے علاوہ عملی زندگی اور بین الاقوامی معاشرت کے تقاضوں سے جڑے ہوئے ہوں۔

میری گزارشات یہ ہیں کہ اردو زبان کو معاشی و معاشرتی نظام سے وابستہ کرنے کی شعوری کوشش اور ٹھوس منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اردو زبان کے حوالے سے ادبی قدر و قیمت کے تعین کے مسئلے کو جس طرح اہمیت دی جاتی ہے اسی طرح زندگی کے تمام شعبوں سے منسلک رہنے والی اس زبان کے عملی پہلوؤں پر غور و فکر کی ضرورت ہے تا کہ ہر سطح پر روزگار کے مواقع پیدا کیے جاسکیں۔ مثلاً دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمان تیار کرنے کا منصوبہ۔ مختلف ممالک کے سفارت خانوں میں اردو زبان سے جڑے ہوئے پریس تیار کرنے کا منصوبہ۔ ٹی وی، ریڈیو او رصحافت کے علاوہ آرٹ مووِیز میں کام کرنے والے اداکاروں، ڈب کرنے والے نیز پرفارمنگ آرٹس سے وابستہ لوگوں کی لسانی تربیت کے کورسز۔ اسی طرح میڈیکل کمپنیوں کے بروشر اور معلوماتی کتابچے تیار کرنے کے لیے اردو خواں طبقہ کی موجودگی ----- ایسے کئی شعبے ہیں جن کے لیے خصوصی طور پر کورسز ڈیزائن کیے جاسکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ملنے والی معلومات سے پتا چلتا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں بچوں کی کارٹون فلموں کو اپنی زبان میں ڈب کرنے کی صنعت یا پیشے سے وابستہ لوگوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ فلموں کے ترجمہ اور ڈبنگ کے لیے عربی اور فارسی زبانوں میں سیکڑوں نہیں ہزاروں افراد مصروف کار ہیں۔ اردو میں اس سے کہیں بڑھ کر مواقع موجود ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اسی معاشرے اور ملک کی زبان بھی مضبوط ہے جس کی معیشت مضبوط ہے۔ معاشرے کے باقی پہلوؤں کی طرح زبان کا مسئلہ بھی معیشت سے وابستہ ہے اور مستقبل میں یہ وابستگی اور زیادہ پختہ ہوتی جائے گی۔ انفرادی کوششوں کے ذریعے شاید زبان کی خدمت نہ ہوسکے۔ اس کے لیے مشترکہ طور پر ایسی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس میں حکومتی ادارے اپنا پورا حصہ اور وسائل ڈالیں۔

تہذیبی اور ثقافتی اداروں کو مضبوط کیا جائے۔ ترجمہ سے وابستہ نئے ادارے مختلف جامعات میں کھولے جائیں۔ نئے کورسز جیسے گریجویشن کی سطح پر بزنس اسٹڈیز اور فائنانس اور انفارمیشن ٹکنالوجی وغیرہ کے کورسیز ڈیزائن کیے جائیں۔ جامعات سے فارغ التحصیل طلبہ و طالبات کے لیے لیکچرشپ کے علاوہ سیکڑوں نئی بہتر ملازمتوں کو تحصیل اردو سے وابستہ کیا جائے۔ بالخصوص انھیں اس بات کا احساس بھی دلایا جائے کہ اردو تعلیم کا مطلب صرف کالج اور اسکول میں استاد بننا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس وسیع ہوتی دنیا میں نئے مقامات اور منازل کی کوشش خود ہی کرنی ہے۔ اس وابستگی میں معاشی کشش کو نظر انداز نہ کیا جائے تا کہ زیادہ ذہین لوگ روزگار سے وابستگی میں اطمینان محسوس کرسکیں۔ اگر ہم اردو کی تعمیر و ترقی کے لیے ایسا آبرومندانہ نظام وضع کرسکیں تو یہ اُردو کی خدمت بھی ہوگی اور اس وسیلے سے ہماری معاشرت و معیشت میں اردو دوست حضرات کو ایک بہتر مقام اور اعتبار حاصل ہوسکے گا۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, G.C. University,
Faisal Abad.

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عبدالعلیم قدوائی

رنگ سازی

دنیائے رنگ و بو میں حسن اور رعنائی رنگوں کی رنگارنگی کی وجہ سے ہے۔ موجودہ دور میں مختلف قسم کے رنگ و روغن، زیبائش، دلکشی، کیڑے مکوڑوں سے تحفظ اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال کیے جارہے ہیں جن کی وجہ سے اس صنعت کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے۔ رنگ سازی کی ٹیکنالوجی نے بھی بڑی ترقی کی ہے کیونکہ رنگوں کا استعمال لکڑی، پتھر، اینٹ، مٹی، پلاسٹک اور مختلف دھاتوں کی سطح پر کیا جاتا ہے، رنگوں میں مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا ہوتے ہیں جن کے الگ الگ کام اور فائدے ہوتے ہیں مثلاً ریزن، پالیمر، پگمنٹس وغیرہ ٹیکنالوجی کے ذریعے ان کو سمجھا جاتا ہے پھر رنگوں کو ملانے، ان کا لیپ چڑھانے اور ضرورت کے مطابق ان کو بار بار چڑھانے، سکھانے کے مراحل کے بارے میں مفید عملی ہدایات ملتی ہیں۔ یہ صنعت چھوٹے پیمانے پر چلانے کے لیے بہت موزوں ہے چنانچہ ہمارے ملک میں بہت سی چھوٹی اکائیاں مختلف قسم کے معیاری رنگ، روغن پالش وارنش وغیرہ بنارہی ہیں اور برآمد بھی کررہی ہیں۔

رنگ و روغن کا استعمال گھروں، ہوٹلوں، اسپتالوں، دفتروں اور دیگر عمارتوں میں بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے اسی کے ساتھ موٹر کاروں، بسوں، اسکوٹروں، ٹرک اور دوسری گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور بحری جہازوں اور کشتیوں اور انجینئرنگ کے شعبے میں رنگوں کا استعمال بڑھتا جارہا ہے۔ ان تمام قسموں میں ٹکنالوجی، کیمیکل اجزا اور رنگ چڑھانے کے طریقوں کی الگ الگ نوعیت ہے اور ان کے ماہرین بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس صنعت میں ریسرچ اور تحقیق کا کام بھی بڑی تیزی سے بڑھتا جارہا ہے۔ اسی نسبت سے روزگار کے مواقع بھی برابر بڑھتے جارہے ہیں۔ قیمتوں کا تقابلی موازنہ، اچھے معیار کو قائم رکھنا اور صارفین کی ضروریات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے جس کے لیے اس شعبے کے ماہرین بڑی تندہی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں اس صنعت میں آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کی غیر معمولی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس کا مستقبل بڑا تابناک ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت رنگ وروغن بنانے والے مشہور کارخانوں میں نیرولاک پینٹس لمیٹڈ، ایشین پینٹس انڈیا لمیٹڈ، برجر پینٹس انڈیا لمیٹڈ، شالیمار پینٹس وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ اس صنعت کی ٹیکنالوجی میں حسب ذیل شعبے شامل ہوتے ہیں۔

1- ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ، 2- پروڈکشن (مصنوعات کی تیاری)، 3- مارکیٹنگ، 4- ٹیکنکل سروسز، صارفین کی ٹیکنیکل دقتوں کو دور کرنے کے لیے مہیا کی جاتی ہیں۔ ان شعبوں میں ٹیکنالوجسٹ، کیمسٹ اور افسر بھرتی کیے جاتے ہیں جن کو ملازمت کی شروعات میں ہی ایک لاکھ پچیس ہزار اور ایک لاکھ پینسٹھ ہزار روپے تک سالانہ مشاہرہ دیا جاتا ہے۔ مگر اچھے اور ترقی یافتہ کارخانوں مثلاً گودریج وغیرہ میں تنخواہ ڈھائی لاکھ روپیہ سالانہ تک مل جاتی ہے۔ اب ان ملازمتوں کا انتخاب کارخانے والے اپنے کیمپس میں انٹرویو کے ذریعے کرنے لگے ہیں۔ ابھی ہمارے ملک میں رنگ وروغن کا فی کس صرف بہت کم یعنی ایک کلو سالانہ کے قریب ہوتا ہے جب کہ دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں ایک شخص 25 تا 30 کلو رنگ و روغن ہر سال استعمال کرتا ہے۔ یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ اس صنعت کے بڑھنے اور ترقی کرنے کے بڑے زبردست امکانات ہیں۔ جس سرعت سے ہمارے ملک کی معیشت ترقی کررہی ہے خاص کر تعمیرات، آٹوموبائل اور دیگر صنعتی سطحوں میں اس حساب سے رنگ روغن کی مانگ اور اس کے ساتھ ہی باصلاحیت افراد کی ضرورت تیزی سے بڑھتی جائے گی۔ اس شعبے میں حسب ذیل اداروں سے مناسب ڈگریاں یا ڈپلوما حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

(1) انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹکنالوجی، ماٹنگا۔ ممبئی۔ پینٹ ٹکنالوجی میں بی ٹیک کی ڈگری۔

(2) گرو ویر انسٹی ٹیوٹ آف کیرئیر ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ، کالینہ، ممبئی۔ انڈر گریجویٹ ڈپلوما پینٹ ٹکنالوجی۔

(3) ہارکورٹ بٹلر ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ، کانپور۔ بی ٹیک پینٹ ٹکنالوجی۔

(4) لکشمی نرائن انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، ناگپور۔ ایم ٹیک پروگرام ان پینٹس۔

(5) انسٹی ٹیوٹ آف کیمن فارمیٹکس اسٹڈیز نوئیڈا۔ پینٹ ٹکنالوجی فاصلاتی کورس۔

رنگ وروغن سازی کی صنعت شروع کرنے کے لیے ضروری معلومات اور رہنمائی ہر ضلع میں واقع ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سنٹر اور ہر ریاست میں واقع مرکزی حکومت کے اسمال انڈسٹریز سروس انسٹی ٹیوٹ سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

□□□

(بشکریہ ایجوکیشن ٹائمز، 22 مئی-2006

انگریزی سے ترجمہ اور تلخیص: عبدالعلیم قدوائی

پتہ:

Zahida Manzil, 4/873, New Friends Colony,
Aligarh (U.P.)

انور ادیب

انٹرنیٹ کے نقصانات اور ان سے بچنے کی تدابیر

انٹرنیٹ جسے سائبر ورلڈ، سائبر وے، انفارمیشن سوپر ہائی وے وغیرہ مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے، دراصل کمپیوٹروں کے ایک مربوط جال کا نام ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور جو چند مخصوص پروٹوکولس اور پروگرامس کی بنیاد پر اصطلاعات کی ترسیل کرتا ہے۔ اس جال (نیٹ ورک) سے جڑے کمپیوٹر، اطلاع حاصل کرتے ہیں اور چند ضوابط کی پابندی کے ساتھ حاصل کردہ اطلاعات کی ترسیل کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ کی ایجاد 1960 کے دہے میں امریکہ کے دفاعی محکمے نے کی۔ ہندوستان میں انٹرنیٹ سروس کا آغاز VSNL (ودیش سنچار نگم لمیٹڈ) نے 15 اگست 1995 کو کیا۔ اس وقت ہندوستان میں اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد 25 ملین سے زیادہ ہے۔ دس گیارہ سال کے عرصے میں زندگی کے ہر شعبے میں اس کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم، تجارت اور سیاست ہر جگہ اس سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ ارباب حل وعقد کی مسلسل کوششوں سے کمپیوٹر خواندگی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ نئی نسل اس کرشماتی ٹیکنالوجی کو خوب استعمال کررہی ہے۔ انٹرنیٹ کے فوائد اور اس کی فراہم کردہ سہولتوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مفید ایجاد ہے لیکن غلط استعمال سے ایک مفید ذریعۂ معلومات خرابیوں کا سرچشمہ بھی بنتا جارہا ہے۔ اس سے گوناگوں مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ اس کے برے اثرات سے بچنے کی تدابیر نہیں کی گئیں تو انسانیت کو زبردست خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔

انٹرنیٹ کے ذریعے پھیلنے والی برائیوں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں پورنوگرافی (Pornography) سرفہرست ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد انٹرنیٹ کا غلط استعمال کرتی ہے۔ جنسی جذبات کی برانگیختگی اور جذبۂ تجسس کی تسکین کا سامان نوجوان انٹرنیٹ سے حاصل کرتے ہیں۔ ''فرینڈ شپ کلب'' بھی جنسی خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ ''ویب کیمرہ'' کے ذریعے زنا تک کے مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ''آن لائن قحبہ گری'' کا پیشہ بھی چلایا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ وغیرہ سے مجازی جنسی عمل (Virtual Sex) کرتے کرتے حقیقی عمل تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے۔ نتیجتاً زنا کی کثرت ہوجاتی ہے۔ طلب لذت اور تسکین شہوت کے لیے جنسی عمل کا رجحان بڑھتا ہے تو خاندان تباہ ہوجاتے ہیں۔ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ کی عبرت ناک مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

جنسی بے راہ روی، ذہنی سکون اور قلب کا اطمینان چھین لیتی ہے۔ اس طرح کی برائی میں ملوث افراد ڈپریشن (Depression) کا شکار ہوجاتے ہیں اور بسا اوقات خودکشی کی نوبت آجاتی ہے۔ شہوت اور نفسانی خواہشات کا ذہن پر جب ہر وقت دباؤ رہنے لگتا ہے تو قوت فکر متاثر ہوتی ہے اور ذہنی استعداد میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ ذہن پر خلاشی کے مسلسل حملے سے طلبہ احساس محرومی (Frustration) کا شکار ہوجاتے ہیں۔ چڑچڑے پن کا غلبہ ہوتا ہے جس سے ماں باپ اور اساتذہ کے ساتھ بدتمیزیاں کر بیٹھتے ہیں۔ پورنوگرافی اور حیاسوز لٹریچر کے علاوہ انٹرنیٹ سے پھیلنے والی اور بھی برائیاں ہیں جنھیں سائبر کرائم (Cyber Crimes) کہا جاتا ہے۔ سائبر جرائم کا مختصر ذکر ذیل کی سطور میں کیا جارہا ہے۔

ہیکنگ (Heaking): اس کا مطلب ہے کسی کمپیوٹر سسٹم یا نیٹ ورک میں غیر قانونی مداخلت۔ ہر وہ عمل جس سے کمپیوٹر یا نیٹ ورک کے داخلی نظام میں تخریب کی جائے ہیکنگ کہلاتا ہے۔ یہ تخریبی کوششیں ذاتی منفعت کے لیے کی جاتی ہیں مثلاً کسی شخص کے کریڈٹ کارڈ کی جانکاری حاصل کرکے اس کے اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقم ہڑپ کرلینا وغیرہ۔

بچوں کا جنسی استحصال: چائلڈ پورنوگرافی ایک ایسا سنگین جرم ہے جس کی سنگینی کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ انٹرنیٹ بچوں کی دسترس میں آجانے کی وجہ سے بچے سائبر جرائم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ بچوں میں انٹرنیٹ کے استعمال کی بڑھتی ہوئی عادت سے بچوں سے جنسی تلذذ حاصل کرنے والے مجرمین کے لیے سازگار مواقع بے حد بڑھ گئے ہیں۔

سائبر اسٹاکنگ (Cyber Staking): انٹرنیٹ سروس کا استعمال کرکے کسی فرد کو مستقل ہراساں کیا جاسکتا ہے۔ اسے سائبر اسٹاکنگ کہا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے یہ بہت آسان ہے۔ اسٹاکر (Stalker) انٹرنیٹ کے ذریعے کسی فرد کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کرلیتا ہے جسے وہ مختلف ویب سائٹس پر پھیلا کر اسے پریشان اور شرمسار کرتا ہے۔ انٹرنیٹ پر جان سے مارنے کی دھمکی، بدنام کرنا، ہراساں کرنا جیسے اقدام عام ہوگئے ہیں۔

سائبر اسکوائنگ (Cyber Squating): کسی مشہور ومعروف تنظیم، ادارے، کمپنی کے نام سے باضابطہ ڈومین نیم (Dimain name) خریدا جاتا ہے اور اس پر گمراہ کن مواد پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے اس کمپنی، تنظیم یا ادارے کی زبردست بدنامی ہوتی ہے۔ اسے سائبر اسکوائنگ کہا جاتا ہے۔ اس غلط تشہیر کو بند کرنے کے لیے خطیر رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بلیک میلنگ کی یہ جدید صورت ہے۔

وائرس اٹیک (Virus Attack): وائرس دراصل ایک قسم کا پروگرام ہوتا ہے جو کسی کمپیوٹر یا فائل سے منسلک ہو کر نیٹ ورک کے تحت ایک فائل سے دوسری فائل اور کمپیوٹر میں گردش کرتا رہتا ہے۔ یہ پروگرام کمپیوٹر کے ڈاٹا کو تبدیل یا مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے۔ اینٹی وائرس سوفٹ ویئر بنانے والی کمپنیاں اور بعض تخریب پسند عناصر یہ حرکتیں کرتے ہیں۔

ویب جیکنگ (Web Jacking): ہائی جیکنگ (Hijacking) مشہور اصطلاح ہے۔ ویب جیکنگ اس اصطلاح سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ جرم پاس ورڈ یا کوڈ ہیکنگ کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ جب کسی ویب سائٹ کو ویب جیک کر لیا جاتا ہے تو اس کے مالک کا اس پر مکمل کنٹرول ختم ہو جاتا ہے۔ کسی معروف ڈومین (Domain) کو ہیکرس (Hackers) اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں اور اس پر موجودہ معلومات کی بجائے غلط قسم کی انفارمیشن لوڈ کر دیتے ہیں۔ اس طرح سائٹ پر وزٹ کرنے والوں اور سائٹ کے مالکان کو بے حد ندامت ہوتی ہے۔ اس ڈومین نیم کو واپس کرنے کے لیے ہیکرس خطیر رقم وصول کرتے ہیں۔ ان جرائم کی فہرست طویل ہے اور ان کی تفصیلات کے لیے ایک دفتر درکار ہے اب آئیے دیکھیں انٹرنیٹ کے نقصانات اور خرابیوں سے بچنے کے لیے کیا صورتیں ہیں۔ بعض خالص معاشی نوعیت کے جرائم سے بچنے کے لیے معاشی ادارے حفاظتی اقدامات کر رہے ہیں لیکن جو مسائل اخلاقی اور معاشرتی نوعیت کے ہیں ان میں کوئی خاطر خواہ پیش رفت نظر نہیں آتی۔

انٹرنیٹ کے جرائم میں سب سے تباہ کن اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والا جرم پورنوگرافی ہے۔ اس پر قابو پانے کے لیے عالمی سطح پر کوششیں ہو رہی ہیں۔ فائر والز (Fire Walls) فلٹرز (Filters) تیار کیے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر کی تنظیمیں اس کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ہندوستان میں انڈین آئی ٹی ایکٹ 2000 میں کمپیوٹر کے ماخذ دستاویز میں تخریب، ہیکنگ، فحش معلومات کی برقی ذرائع سے تشہیر، چائلڈ پورنوگرافی اور کونفیڈنشیل ریکارڈ کو واشگاف کرنے کو جرم قرار دیا گیا ہے لیکن ابھی اور قوانین اور ان کے سختی سے نفاذ کی ضرورت ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سائبر جرائم کے خلاف جو قوانین بنائے جا رہے ہیں ان کا تعلق ان جرائم سے زیادہ ہے جو سرمایہ داروں کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ حیا سوز اور فحش مواد پر روک لگانے کو ''فری سوسائٹی'' کے قیام کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں عملی اقدامات کی گنجائش کے باوجود کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اگر چہ ہمارے ملک میں الکٹرونک ذرائع سے فحش لٹریچر کے فروغ کو انڈین آئی ٹی ایکٹ 2000 کے تحت جرم قرار دیا گیا ہے لیکن اس کی اثر اندازی اور عملی نفاذ کی کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

انٹرنیٹ کے ذریعے فحاشی اور عریانیت کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے قوانین کافی نہیں ہیں اس کے لیے اخلاقی قدروں کے احترام کے جذبے کو ابھارنا ضروری ہے۔ خواہش نفس کی پیروی کا جذبہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ انٹرنیٹ کی دس گیارہ سالہ تباہ کاریوں کو زیر بحث لا کر سماج کو اس کی مزید برائیوں سے بچانے کی فکر کی جائے۔

پتہ:
Ibrahim Manzil
Mosaddi Mohalla,
Railpar,
Asansol-713302 (W.B.)

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

قرۃ العین حیدر

(ہماری مطبوعات)

پرواز کے بعد

جیسے کہیں خواب میں جنجر راجرز یا ڈائنا ڈربن کی آواز میں ''سان فرینڈ وو یلی'' کا نغمہ گایا جا رہا ہو اور پھر ایک دم سے آنکھ کھل جائے۔ یعنی وہ کچھ ایسا سا تھا جیسے مائیکل انجلو نے ایک تصویر کو مکمل کرتے کرتے اُکتا کر یوں ہی چھوڑ دیا ہو اور خود کسی زیادہ دلچسپ موڈل کی طرف متوجہ ہو گیا ہو، لیکن پھر بھی اس کی سنجیدہ سی ہنسی کہہ رہی تھی کہ بھئی میں ایسا ہوں کہ دنیا کے سارے مصور اور سارے سنگ تراش اپنی پوری کوشش کے باوجود مجھ جیسا شاہکار نہیں بنا سکتے۔ چپکے چپکے مسکرائے جاؤ بے وقوفو! شاید تمھیں بعد میں افسوس کرنا پڑے۔

گرمی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ پام کے پتوں پر جو مالی نے اوپر سے پانی گرایا تھا تو گرد کہیں کہیں سے دھل گئی تھی اور کہیں کہیں اسی طرح باقی تھی۔ اور بھیگتی ہوئی رات کوشش کر رہی تھی کہ کچھ رومینٹک سی بن جائے۔ وہ بر فیلی لڑکی، جو ہمیشہ سفید غرارے اور سفید دوپٹے میں اپنے آپ کو سب سے بلند اور الگ سا محسوس کروانے پر مجبور کرتی تھی، بہت خاموشی سے ہکسلے کی ایک کتاب ''پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ'' پڑھے جا رہی تھی جس کے ایک لفظ کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں نہ گھس سکا تھا۔

وہ لیمپ کی سفید روشنی میں اتنی زرد اور غمگین نظر آ رہی تھی جیسے اس کے برگنڈی کیوٹکس کی ساری شیشیاں فرش پر گر کے ٹوٹ گئی ہوں یا اس کے فیڈو کو سخت زکام ہو گیا ہو— اور لگ رہا تھا جیسے ایک چھوٹے سے گلیشیر پر آفتاب کی کرنیں بکھر رہی ہیں۔

چنانچہ اس دوسری آتشیں لڑکی نے، جو سینئر بی. ایس. سی کی طالب علم ہونے کی وجہ سے زیادہ پریکٹیکل تھی اور جو اس وقت برآمدے کے سبز جنگلے پر بیٹھی گملے میں سے ایک شاخ توڑ کر اس کی کمپاؤنڈ اور ڈبل کمپاؤنڈ پتیوں کے مطالعے میں مصروف تھی، اس بر فیلی لڑکی کو یہ رائے دی تھی کہ اگر گرمی زیادہ ہے تو ''پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ'' پڑھنے کے بجائے سو جاؤ یا پھر نئے ریفریجریٹر میں گھس کر بیٹھ جاؤ، اس کا اثر دماغ کے لیے مفید ہوگا لیکن چونکہ یہ تجویز قطعی ناقابلِ عمل تھی اور کوئی دوسرا مشورہ اس سائنس کے طالب علم کے ذہن میں اس وقت نہیں آ رہا تھا اس لیے وہ بر فیلی لڑکی رخشندہ سلطانہ اسی طرح ہکسلے سے دماغ لڑاتی رہی اور وہ آتشیں لڑکی شاہندہ بانو پیر ہلا ہلا کر ایک گیت گانے لگی جو اس نے فرسٹ اسٹینڈرڈ میں سیکھا تھا اور جس کا مطلب تھا کہ جب شاہ جارج کے سرخ لباس والے سپاہیوں کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز بازگشت ہماری پرانی اسکاٹس پہاڑیوں کے سناٹے میں ڈوب جائے گی اور اپریل کے مہتاب کا طلائی بجرا موسم بہار کے آسمانوں کی نیلی لہروں میں تیرتا ہوا تمھارے باورچی خانے کی چمنی کے اوپر پہنچ جائے گا اس وقت تم وادی کے نشیب میں میرے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنوگی۔ اے سرائے کے مالک کی سیاہ آنکھوں اور سرخ لبوں والی بیٹی!

لیکن رات خاصی گرم ہوتی جا رہی تھی اور ماہم کا ایک کونہ، جو سمندر میں دور تک نکلا چلا گیا تھا، اس پر ناریل کے جھنڈ کے پیچھے سے چاند طلوع ہو رہا تھا اور دور ایک جزیرے پر ایستادہ پرانے کیتھیڈرل میں گھنٹے کی گونج اور دعائے نیم شبی کی لہریں لرزاں تھیں اور اس وقت مائیکل انجلو کے ادھورے سے شاہکار جم کو ایک بڑی عجیب سی ناقابلِ تشریح کوفت اور الجھن سی محسوس ہو رہی تھی جس کا تجزیہ وہ کسی طرح بھی نہ کر سکتا تھا— حالانکہ وہ مطمئن تھا کہ ایسے حادثے وہاں تقریباً روز شام کو ہو جاتے ہیں— پھر بھی وہ یک لخت بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج دوپہر اس کو بہت تلخی سے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ مغرور، پھولے پھولے بالوں والی بر فیلی سی لڑکی، جو ہر وقت اپنے مجسموں پر جھکی رہتی ہے، اوروں سے کس قدر زیادہ مختلف ہے۔ جب اس نے اس چھوٹے سے قد والی لڑکی سے، جس کی چھوٹی سی ناک پر بے اختیار پیار آ جاتا تھا اور جسے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد احتیاط سے پاؤڈر کر لیتی تھی اور جس کی بڑے سے گھیر کی زرد ٹوپی پر گہرے سبز شنائل کی ٹہنیوں سے بندھے ہوئے چیری کے مصنوعی شگوفے

''آئینۂ جہاں'' سے ماخوذ، از: قرۃ العین حیدر، صفحات 600، قیمت : -/266

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہنس رہے تھے، بے حد اخلاق کے لہجے میں پوچھا تھا کہ میرے ساتھ شام کو کھانا کھانے چلوگی تو اس نے جواب دیا تھا: ''ہاں چلو۔'' اور پھر وہ اس کے ساتھ ہلکے پھلکے قدموں سے زینہ طے کر نیچے سڑک پر آگئی تھی اور بس اسٹینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے اس چھوٹی سی لڑکی نے جس کی طرح کی لڑکیاں اپالو بندر یا کناٹ پلیس میں تیزی سے ادھر ادھر جاتی نظر آتی ہیں، اس سے پوچھا تھا: ''تم نے اسکول کب سے جوائن کیا ہے؟''

''ابھی ایک ٹرم بھی پوری نہیں ہوئی۔'' اور نام کیا ہے تمھارا؟''

''مگ — میگڈیلین ڈی کوڑا۔'' ''اور تمھارا؟''

''جم — جمال — جمال انور — جو تم پسند کرو۔''

اور پھر وہ دونوں بس اسٹینڈ کے مجمع میں رل مل گئے تھے اور ان کے جانے کے بعد برفیلی لڑکی اپنے بال پیچھے کو سمیٹ کر اپنے دن بھر کے کام کو غور سے دیکھتی ہوئی اپنی کار کے انتظار میں کلاس روم کی کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی۔

اور وہ پیاری سی ناک والی مگ روز، شام کی طرح، خداوند خدا کی کنواری ماں کی تصویر کے آگے شمع روشن کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ مجسموں میں اگر احساس زندگی پیدا ہوجائے تو بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ اور پھر بھلا نتائج پر کون غور کرتا پھرے۔ طوفانی لہروں کا ایک ریلا جو ساحلوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا سیاہ آنکھوں والا فن کار کی گرم سانسوں نے اس سرد اور بے روح مجسمے میں جان ڈال دی تھی۔ گلیشیا کی طرح — لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ کاش کارل مسل ٹو کے نیچے اس سے کبھی نہ ملتا۔ بیگ، جس نے اپنی عمران سرد مجسموں کی معیت میں گزار دی تھی جو اس کے چھوٹے سے قصبے کی خانقاہ کے بھورے پتھروں والے اندھیرے ہال اور دوسرے کمروں میں پھیلے پڑے تھے۔ برسوں سے ایک ہی طرح سینٹ اگنس، سینٹ فرانس اور سینٹ جارج — زندگی منجمد پتھروں کا ایک ڈھیر تھی اور پیدا ہونے کے جرم کی پاداش، Ave Maria کی خوابیدہ موسیقی کی کتاب کا نیلا ربن — پر بہت پرانی بات تھی یہ۔

پھر اس کی آنکھیں نیوریلجیا کے شدید درد سے بند ہونے لگیں اور وہ اپنے ننھے سے سفید پلنگ پر گر گئی۔ کارل اور اس کا گٹار، کارل کی رابرٹ ٹیلر جیسی ناک جس پر ایک شام روشن ایرانی نے غصے میں آکر ایک مکہ رسید کیا تھا۔ روشن ایرانی اور اعظم مسعود اور آفتاب، جم کے وہ تین یونہیمین قسم کے دوست جو دن بھر برٹش نیوز ایجنسی میں کام کرنے کے بعد شام کو پیانو بجا بجا کر شور مچایا کرتے تھے۔ پھر گیٹ وے آف انڈیا کی عمارتوں کے وہ اندھیرے سائے، وہ ہسپانوی سرینیڈ۔

کلاس میں وہ برفیلی لڑکی ایک آدھ بار بے پروائی سے نظر اٹھا کر اسے دیکھتی اور پھر بڑی مصروفیت سے مجسمے پر جھک کر اس کے پیر تراشنے لگتی اور مائیکل انجلو کے شاہکار کے ادھے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر کے رہ جاتی۔

اور مگی کی بہت سی راتیں اسی طرح گزر گئیں۔

بولیوار کے درختوں کے سائے میں، کھلے آسمان اور چمکتے ستاروں کے نیچے، موسم گرما کا جشن منانے والے رخشندہ کو وہ سارے پرانے گیت یاد دلائے دے رہے تھے جن کی دھنیں سنتے ہی اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا۔ ٹارا لارا — ٹارا لارا جون پیل — روز ماری — گڈ نائٹ مائی لو — مرایا لیلیٹیا — چاندنی میں ڈوبے ہوئے سمندری ریت کے ٹھنڈے ٹیلوں پر سے دوسرے ساتھیوں کے گیتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریت پر ٹہلتے ٹہلتے تھک کر رخشندہ کہنے لگی: ''برج ماتا کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم سب ایک دوسرے کو غمگین بنائے بغیر زندگی گزار سکیں اور سارے کام ہمیشہ ٹھیک ٹھیک ہوا کریں۔ دنیا کے یہ عقل مند لوگ —''

رات خاموش ہوتی جارہی تھی۔ برج کو اس سے خیال آیا کہ اس نے ایک فلم میں، شاید ''بلڈ اینڈ سینڈ'' میں، ایک بے حد پیارا جملہ سنا تھا جو اس کو اب تک یاد تھا: "Madam, walking along in life with you has been a gracious time"

رخشندہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ان کے قدموں کے نشان ریت پر ان کے پیچھے پیچھے بنتے جارہے تھے اور بحیرۂ عرب کی نیلی نیلی ٹھنڈی موجیں ان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رخشندہ رانی، چاند ہنس رہا ہے، تم بھی مسکراؤ —

اوہ انکل ٹوبی — تم اتنے اچھے سے ہو۔ میں سچ مچ بے انتہا بے وقوف ہوگئی ہوں۔ کیونکہ اس نے سنا تھا کہ اس کا ہونے والا منگیتر مہنگی اسکول آف اکنومکس سے ڈگری لینے کے بعد گھر واپس جانے کے بجائے یہاں صرف اس لیے رہتا ہے کیونکہ یہاں اس کی ایک کیپ موجود ہے اور وہ ڈرنک بھی کرتا ہے اور موسم گرما کی چاندنی راتوں میں اپنے یونہیمین دوستوں کے ساتھ اپنی سرخ گرجتی ہوئی کار میں ورسووا اور جوہو کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے — اور آتشیں لڑکی نے چلا کر کہا تھا: اوہ تم کیسی پاگل ہو۔ اوہ خدا —

اوہ خدا — وہ کیسے دن تھے — وہ کیا زمانہ تھا۔ انیس بیس سے لے کر چوبیس پچیس سال تک کی وہ عمریں — ذرا ذرا سی بات، معمولی سے واقعات، جذبات کی لہریں، بڑی زبردست ٹریجڈی یا کامیڈی یا میلوڈراما معلوم ہوتی تھیں۔ وہ چاروں دوست ایک دوسرے کے خیالات و افکار، دکھ سکھ اور محبتوں کے شریک۔ مہینے کے آخر میں رومن رولاں یا شا کی کتابیں خریدنے کے لیے اپنا فاؤنٹین پن بیچنے کو تیار۔ مگ کی حفاظت اور عزت کی خاطر کارل کی دل کش ناک پر مکہ رسید کرنے کو مستعد۔ شام کو مادر مقدس کی تصویر کے سامنے شمع جلانے کے بعد مگ ان کے لیے چائے تیار کرتی۔ ان کے اور بہت سے دوست

آتے اور وہ سب دیوان پر، صوفے پر، قالینوں پر بیٹھ کر مصری تمبا کو کا دھواں اڑاتے ہوئے جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے— لمبی لمبی بحثیں اور تنقیدیں جن کو وہ بالکل نہ سمجھ سکتی۔

آسکر وائلڈ کی زندگی، ڈی.ایچ. لارنس، لیگی وزارتوں کی چپقلش، ریڈ اسٹار اور رشیا، بنگال، خدا اور مذہب— اور اکثر وہ جوش میں آ کر ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے کہ وہ خوف سے لرز اٹھتی اور مریم کی طرف عفو طلب نگاہیں اٹھا دیتی۔ پھر کوئی چیز ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو وہ اسے ڈانٹ دیتے تھے۔ مہینہ ختم ہونے سے بہت پہلے اگر پٹرول کے کوپن تمام ہو جائے یا بار بار ری ٹیچنگ کرنے پر بھی کوئی تصویر درست نہ ہو سکتی یا فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے سے قبل ہی پکنکوں اور سینما کے ٹکٹوں پر سارا روپیہ ختم ہو جاتا تو وہ چاروں فوراً اپنے آپ کو wrecks of life سمجھنے پر مستعد ہو جاتے اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے کہ وہ فن کار ہیں اس لیے زندگی کے ان زبردست مصائب میں گرفتار ہیں— اور مگ کو ان کے بچپن پر پیار آ جاتا۔

—اومیگڈلین— او موسم گل کے نیلے پرندو—

بحیرۂ عرب سے اٹھنے والے بھاری بھاری بادل 23 کالج روڈ، ماننگا کے اس فلیٹ کی جانب اڑتے چلے آ رہے تھے جس کے نیچے ایک سیاہ بیوک آ کر رکی۔ اور زینے طے کرنے کے بعد دروازے پر پہنچ کر کسی نے زور سے گھنٹی بجائی اور چمکیلے پتھروں سے سجی ہوئی دو شان دار خواتین اندر آ کر صوفے پر اس طرح بیٹھ گئیں گویا ایسا کرنے کا انھیں پورا پورا حق حاصل تھا۔ تین دوست گھبرا کر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر کمرے میں ایک عجیب حساس سی خاموشی طاری ہو گئی۔ کھڑکیوں کے باہر بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے۔

''آپ جمال انور احمد کے دوست ہیں نا؟'' اس خاتون نے، جس کے اونچے اونچے ہائی ووڈ اسٹائل کے بال تھے، ساری کے آنچل کو بازو پر لپیٹتے ہوئے گہری آواز میں پوچھا۔ وہی ڈرامہ شروع ہونے والا تھا جو ایسے موقعوں پر آج تک ہزاروں مرتبہ کھیلا جا چکا ہے۔

''وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ وہ یہاں رہتا ہے؟'' دوسری، زیادہ فربہ خاتون نے سوال کیا۔ عورت— انھوں نے مگ کو ایک پیاری سی، معصوم سی، رنگین تصویر کے سوائے اور کسی زاویۂ نظر سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔

عورت— اس کے لیے بڑا بھونڈا لفظ تھا— وہ تو یاسمین کی کلیوں کا خواب تھی۔ بس وہ سوچنے لگے کہ ان شہزادیوں جیسی عالی شان خواتین سے کن الفاظ میں اور کس طریقے سے بات کریں۔ پہلی کم عمر خاتون نے یہ خیال کر کے کہ شاید یہ جرنلسٹ اور فن کار ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں ذرا نرمی سے پوچھا:

''میرا مطلب ہے کہ وہ خاتون کون ہیں اور یہاں کب سے.....'' مگ کے لیے ''خاتون'' کا لفظ بھی بڑا عجیب سا معلوم ہوا۔ مگ تو بس مگ تھی۔ یاسمین کی ایک بڑی سی کلی۔

''آپ انھیں جانتے ہیں؟''

''جی ہاں، بہت اچھی طرح سے۔''

''معلوم ہوا ہے کہ ایک مس میگڈلین ڈی کورڈا—''

''جی— جی ہاں درست بالکل— جی—''

وہ تینوں ایک دم پھر پریشان ہو گئے۔ معاف فرمایئے گا یہ— یہ ہم کو نہیں معلوم۔''

''خوب— اور انھیں آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔''

''کیا یہ لڑکی کسی باعزت طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔'' دوسری خاتون نے بزرگانہ بلندی سے کہا۔

باعزت طبقہ— مگ کے متعلق یہ ایک نیا انکشاف تھا جو پہلے ان کے دماغ میں کبھی نہ آیا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک چپکے سے دیوان پر سے اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

''باعزت— ار— دیکھیے اس لفظ کو مختلف معنوں میں لیا جا سکتا ہے— خصوصاً اس شہر کی سوسائٹی میں— یعنی کہ— ار—''

اعظم مسعود سینٹ زیویر میں لاجک کا بہت اچھا طالب علم رہ چکا تھا۔ دل میں اس نے کہا کہ کم بخت جم کا بچہ خود تو غائب ہو گیا اور ہم اس مصیبت میں پھنس گئے۔ آنے دو گدھے کو۔

زینے کی طرف کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور وہ اندر آئی۔ اور اس نے ان معزز مہمانوں کو ایک لمحے کے لیے غور سے دیکھا اور ذرا پیچھے کو ہٹ گئی۔

''آپ مس کورڈا ہیں؟ میرا مطلب ہے— معاف کیجیے گا ہم آپ کے گھر میں اس طرح بلا اجازت اور بغیر اطلاع آ گئے لیکن—''

''ماڈ موزیل آپ غلطی پر ہیں۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرے پاس فرسٹ فلور پر صرف ایک کمرہ ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے چائے اور کھانا تیار کرنے یہاں آئی ہوں۔''

اور ان دونوں اونچی خواتین نے اپنی بلندی پر سے جھک کر دیکھا کہ وہ محض ایک سفید فام باورچن ہے— یعنی یہ بڑی بڑی آنکھوں والی بھولی سی لڑکی— اسی کی طرح کی دوسری سفید فام یہودی اور اینگلو انڈین لڑکیوں میں سے ایک— اُف۔ نفرت کی پوٹ۔ گفتگو بہت طول کھینچ رہی تھی۔ بڑی خاتون نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا:

''دیکھو لڑکی— کیا تم میرے لڑکے کو پسند کرتی ہو؟'' کیسا بے وقوفی کا

سوال تھا۔ اس نے سوچا، بھلا جم کو کون پسند نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں بے ساختگی سے اوپر اٹھا کر پوچھا: ''کیا جم خود آپ کو پسند نہیں؟''

''—اوہ— لیکن میری بچی جم تو خود میرا اپنا لڑکا ہے۔'' کمرے میں پھر وہی عجیب سا سکوت چھا گیا۔

''اور مجھے پتا چلا ہے کہ میرا لڑکا تم سے شادی کرنے کو بھی تیار ہے— جانتی ہو اس کے کیا معنی ہیں— اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

اوہ— او خدا— اب تو یہ سب کچھ برداشت سے قطعی باہر تھا— روشن ایرانی بلی کی طرح کشن ایک طرف پھینک کر دیوان پر سے کھڑا ہوگیا اور مگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جیسے قیمتی چمکیلے پتھروں میں بجی ہوئی ساڑھے تین سو اونچی اونچی باعزت خواتین چاروں طرف سے مگ پر حملہ کرنے والی تھیں۔ ہوا کے زور سے دروازوں کے پٹ بند ہوگئے۔ باہر بارش کے پہلے قطرے کھڑکی کے شیشیوں سے ٹکرا رہے تھے۔

— تم خوب صورت تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھر دو اور وہ ہمیشہ ان تصویروں کی اصلیت کا یقین کرتی رہے گی۔ تمھارا کام صرف یہی ہے کہ اس سے خوش نما، خوش گوار ستاروں کی باتیں کرتے رہو۔ اس کی ماں نے اسے بچپن میں بتایا تھا کہ شیطان کی اتنی لمبی دم ہے، اتنے بڑے سرخ کان ہیں، ایسے نوکیلے سینگ ہیں۔ وہ بہت ہی برا ہے اور دنیا جب بہت ہی بری جگہ بن گئی تو ایک طوفان آیا اور نوح، جو ایک بہت عمدہ انسان تھا، اپنے باعزت خاندان سمیت بچ رہا— اور پھر ابراہیم اور سلیمان اور داؤد اور موسیٰ— جو سب ایک سے ایک اچھے لوگ تھے— دنیا کو ٹھیک کرنے کے لیے آئے۔ خود خدا کو زمین پر آکر جھیل کی سطح پر چلنا پڑا— وہ ان سب باتوں پر یقین رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے بچے اپنے نرسری کے قصوں اور پیٹر پین اور اسنو وائٹ کی کہانیوں کو سچ سمجھتے ہیں۔ لیکن بچے بڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے ہاتھ سے زیتون کی ڈالیاں اور للّی کے پھول چھین کر انھیں چپکے سے کانٹوں کا تاج پہنا دیا جاتا ہے اور پھر ساری حقیقت معلوم ہوجاتی ہے۔

تم اس سے وعدہ کرتے ہو کہ آج رات کو سارے چاند ستارے توڑ کر اس کے آگے ڈال دو گے۔ لیکن اسی رات کو اولمپس پر رہنے والے خداؤں کی بیویاں اس سے یہ وعدہ بھی چھین لیتی ہیں۔ اور تم ان ٹوٹے ہوئے چاند ستاروں کا سامنا نہیں کر سکتے— روشن بیٹے ذرا اپنے بلند و مقدس یزداں کو آواز دینا۔

اعظم مسعود نے تھک کر پائپ جلا لیا اور وہ سب خاموش ہوگئے۔ وہ مصور تھے، انگریزی کے عمدہ جرنلسٹ تھے، معاشیات اور ادبیات میں ایم۔اے۔ کر چکے تھے، پولکا اور والز خوب کرتے تھے، اور سی۔بی۔آئی۔ کے سوئمنگ ٹینک کے کنارے گھنٹوں پڑے رہا کرتے تھے لیکن میگڈلین اپنا گٹار سنبھال کر کارل کے ساتھ اپنی قسمت آزمائی کرنے کہیں اور، کسی دوسرے دیس کو چلی گئی اور وہ اسی طرح دیوار پر پڑے رومن رولاں اور شا کا مطالعہ کرتے رہے۔

ان دونوں نے میٹرو میں نیچے اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مرحوم لیزلی ہاورڈ پر افسوس کرنا شروع ہی کیا تھا کہ برابر کی نشست پر سے کسی نے پوچھا: ''مادام! یہ سیٹ ریزرو تو نہیں؟''

''جی نہیں۔'' رخشندہ نے ادھر دیکھے بغیر جواب دیا اور پھر برج کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئی۔ نو وارد نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلاتے ہوئے پھر پوچھا: مادام! دھواں آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا۔''

''جی نہیں۔''

اب کے سگریٹ لائٹر کی روشنی میں رخشندہ نے اس کی طرف نظر کی اور اسے لگا جیسے سارا میٹرو ڈائنامیٹ سے اڑ کر دور فضاؤں میں لڑھکتا جا رہا ہے اور برج لال کھڑے ہو کر ڈریس سرکل میں جانے کے لیے شاہندہ اور شیاملا کا انتظار کرنے لگا— ''رشی رانی جلدی اٹھو۔'' مجمع زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے گینگ وے کو پار کر کے زینے پر چڑھنے لگے۔ وہ شخص اپنی نشست پر بیٹھا دوسری طرف دیکھتا رہا۔ فلم شروع ہوچکی تھی۔ پردے پر برٹش مووی ٹون نیوز کی تصویریں کوندنے لگیں۔

''اوہ برج ماما جلدی اوپر چڑھیے۔'' رخشندہ کی برفیلی پیشانی پر پانی کے ننھے منے قطرے نہ جانے کہاں سے آگئے۔ برج نے اس کا سفید ہاتھ پکڑ کر اسے سب سے اوپر سیڑھی پر کھینچ لیا اور وہ مجمعے کے ریلے کے ساتھ ایک جھونک سے اس کے اوپر گر سی گئی۔ وہ اندھیرے میں شیاملا اور شاہندہ کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑا لیا۔

وہ دیر تک اتنی سی بات کو سوچتی رہی۔ پھر اس کا جی چاہا کہ ایک زبردست زلزلے میں یہ سارا میٹرو ٹوٹ کر گر جائے اور برج اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کہیں دور بھاگ جائے— گرتے پہاڑوں اور ٹوٹتی چٹانوں اور شور مچاتے ہوئے انسانوں سے بچا کر بہت دور— اور پھر وہ— وہ دوسرا شخص— وہ مائیکل اینجلو کا شاہکار— نیچے بیٹھا تھا— چند منٹ قبل اس کے بہت نزدیک—

اور پھر دوسری رات کو آتشیں لڑکی نے اسے تاج میں دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ ایک تیز آگ میں اسے جلا کر راکھ کر ڈالے، اس کی بکھری ہوئی مسکراہٹ کو، اس کے الجھے الجھے بالوں کو— وہ اس صوفے پر بیٹھ آئی تھی، اس گیلری میں سے گزری تھی، ان کشنوں کو چھو چکی تھی جن پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی شامیں گزار چکا تھا جب کہ وہ دوسری برفیلی رخشندہ خاموشی اور سکون سے ہکسلے اور بیورلی نکلسن پڑھتی رہی تھی۔ ''مس ڈی کورڈا کیسی ہیں؟'' اس نے پوچھا، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ جا چکی ہے۔

"اچھی ہیں۔ شکریہ!" اس نے اسی سکون سے جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ ایک راؤنڈ لیں گی؟"

"آیئے—" اس نے کہا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ بہت پریکٹیکل رہتی تھی— اور جمال کو تعجب ہوا کہ وہ آسانی سے اس کے ساتھ فلور پر کیسے آ گئی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رمبا کی مومنٹ کے ساتھ ساتھ آگ کے شعلوں میں گھوم رہا ہے۔ اسے سرد چھینٹوں کی ضرورت تھی لیکن شعلے بہت اونچے اٹھتے جا رہے تھے۔ رقص ہوتا رہا۔ کلارنٹ پر ایک نغمہ پوری تیزی سے بج رہا تھا۔ اس کی تھکی ہوئی نظریں خود بخود پلائی ووڈ کی ان دیواروں کی طرف اٹھ گئیں جن کے دروازوں پر گہرے سبز پردے پڑے تھے اور جن کے سامنے فرن کی ڈالیاں برقی پنکھوں کی ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

سارے ریڈیو اسٹیشن آدھی رات کا گجر بجا چکے تھے۔ باغ کی چتیاں اور سمندر کی لہریں خوابستان کے جادو میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ کسی نے بڑی پیاری آواز میں کہا: "میں آ سکتا ہوں؟" وہ جواب تک برآمدے میں آرام کرسی پر لیٹی "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اپنا برف جیسا لباس سمیٹ کر جنگلے پر جھک گئی۔ "کون ہے؟" اس نے ذرا گھبرا کر برساتی کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ کہیں گی تو میں ابھی ابھی فوراً واپس چلا جاؤں۔" اس کا بات کرنے کا انداز بے حد دل کش تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی—

"ماہم سے باندرہ کا قریب ترین راستہ—"

"جی نہیں۔ میں راستے کی تلاش میں آپ سے مدد کی درخواست نہیں کر رہا—"

"—تو کیا— کیا پٹرول ختم ہو گیا ہے؟"

"جی نہیں میرے پاس ڈھیروں گیلنوں پٹرول موجود ہے۔"

"پھر— پھر— آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں! کچھ بھی نہیں— میں سامنے سے گزر رہا تھا، آپ کو بادام کی شاخوں میں سے برآمدے میں بیٹھا دیکھا تو بس چلا آیا اندر— جاؤں واپس؟"

"اوہ گوش— آپ نے اتنی دور سے مجھے کیسے دیکھ لیا۔ مشاہدہ بہت تیز ہے۔"

"جی ہاں، مشاہدے کا میں ماہر ہوں۔ بہت عمدہ عادت ہے۔ یہ زندگی بہت دلچسپ ہو جاتی ہے اس سے ایسی ایسی چیزیں نظر آ جاتی ہیں۔ اور اجازت دیجیے انگریزی میں کہوں کہ ہم ایسی چیزوں کی روح میں گھس سکتے ہیں جن کو دیکھنے کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہیں— سگریٹ پی لوں؟ شکریہ—"

"نہ جانے آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ خصوصاً جب کہ آپ مجھے قطعی جانتے بھی نہیں۔ بہت دلچسپ اور عقل مند معلوم ہوتے ہیں آپ—"

"جی ہاں شکر ہے۔ غالباً آپ پہلی خوب صورت لڑکی ہیں جس نے ایک عقل مند لڑکے کے سامنے یہ اقرار کیا ہے ورنہ عموماً مجھے آپ جیسی لڑکیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنی عقل کے مقابلے میں کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔

"بیٹھ جایئے، اس آرام کرسی پر— مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں اور اس وقت، اس گرم رات میں، بادام کی شاخوں کی سرسراہٹ کے نیچے اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں— نا؟"

"جی ہاں— بہت عجیب— دنیا میں بہت سی باتیں حد سے زیادہ عجیب ہوتی ہیں جن کا بالکل آپ کو احساس نہیں ہوتا— ار— دیکھیے لڑکیوں میں ہیرو ورشپ کا مادہ ایک بڑی سخت کمزوری ہے—"

"ہیرو ورشپ؟"

"جی— اس وقت آپ مجھے بس چپکے چپکے ایڈ مائر کیے جا رہی ہیں حالانکہ ابھی چند لمحے قبل جب آپ تصور میں جم کے ساتھ مسوری میں سیب کے درختوں کے نیچے بیٹھتی تھیں تو میرے دخل در معقولات پر آپ کو زوروں کا غصہ آ گیا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"سیب کے درخت؟"

"جی ہاں۔ سیب کے درخت!"

"مجھے یقین ہے کہ—"

"جی— کہ رات گرم ہے اور چاند کے جادو کا اثر شاید مجھ پر بھی ہو گیا ہے۔ اسی لیے میں اپنے بستر پر آرام کرنے کے بجائے ماہیم کی خاموش سڑکوں پر مارے مارے پھر کر خوب صورت لڑکیوں کے بنگلوں میں گھس کے ان سے الٹی الٹی باتیں کرنے کا عادی ہو گیا ہوں—"

"اوہ گوش—!"

"دیکھیے شاید آپ نے شمال کے برفانی کوہستانوں میں خوابیدہ کسی کانونٹ میں اب تک اپنی عمر گزاری ہے۔ کم از کم آپ نے سینٹ زیویرز میں تو کبھی نہیں پڑھا۔"

"آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟"

"کیوں کہ آپ بات بات پر اوہ گوش کہہ کر خدا کی مدد چاہتی ہیں حالانکہ میں آپ کو— یقین دلاتا ہوں کہ ایسی خوش گوار رات میں خدا کو ہماری باتوں پر غور کرنے یا ان میں مداخلت کرنے کی قطعی ضروری یا فرصت نہیں اور یہ بھی کہ سینٹ زیویرز کی لڑکیاں زیادہ تیز اور صاف گو ہوتی ہیں— آپ بے۔ بے

اسکول میں ہیں نا؟"

وہ اسی طرح سگریٹ کے حلقے بنا کر کہتا رہا: "دلچسپ خیال ہے۔ سیب کے درختوں کے جھنڈ میں ملکہ پکھراج کے ریکارڈ بج رہے ہوں یا کوئی درگا میں گا رہا ہو، سکھی موری روم جھم، سکھی موری روم جھم بدروا۔۔۔ پسند ہے درگا کا خیال۔۔۔ دیوی بھجو درگا بھوانی۔۔۔"

"لیکن کم از کم مجھے اپنا نام تو بتا دیجیے۔۔۔"

"میرا نام۔۔۔ برج راج بہادر وارشنے۔۔۔ جمال انور۔۔۔ روشن ایرانی۔۔۔ جو چاہو سمجھ لو۔۔۔ ادھر دیکھو۔۔۔ میں تمھارا خواب ہوں اور تم چاندنی اور پھولوں کا گیت۔۔۔ پر مجھ میں اور ان لہروں میں، جو تمھارے برآمدے سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہیں، ایک چھوٹا سا فرق ہے۔ یہ دنیا سے بغاوت کرنا چاہتی ہیں اور کچھ نہیں کر پاتیں۔ میں دنیا سے بغاوت نہیں کرتا لیکن چاندنی رات میں تمھارے بنگلے پر آکر بیٹھ جاتا ہوں اور پھر یہ لہریں ساحل کو چھوڑ کر دور سمندر کی گہرائیوں میں جا کر کھو جاتی ہیں۔ سیب کے باغ میں چپکے سے خزاں گھس آتی ہے۔ بادام کی کلیاں اور سبز پتے خشک ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور ملکہ پکھراج کے ریکارڈ اور تان پورے کے تار ٹوٹ جاتے ہیں ایک دن۔۔۔ اور آخر میں نیلے پروں والی چڑیاں خزاں زدہ شاخوں پر سے اپنے پر پھیلا کر بہار کے تعاقب میں دور جنوب کے ہرے مرغزاروں کی جانب اڑ جاتی ہیں۔۔۔ جب خواب پچھلی رات کی چاندنی کی طرح پھیکے پڑنے لگتے ہیں اس وقت کی بے کیفی اور الجھن کا خیال کرو۔ سچ مچ کی مسرت تم کہیں بھی نہیں پاسکتیں رخشندہ بانو۔ شاید تم سوچ رہی ہو کہ اگر میگڈلین تمھیں مل جائے تو تم اپنی برفانی بلندی پر سے اس سے کہو: کارل ریوبن کے ساتھ کہیں بہت دور چلی جا اے بے حقیقت لڑکی۔۔۔ اس کا گٹار اور تیری آواز۔۔۔ یہی تیرا بہترین راستہ ہے۔ برج راج بہادر سے تم کہو: انکل ٹوبی آپ میری دوست شیاملا کے ایک خوب صورت اور ڈیشنگ سے ماموں ہیں جو اپنی سیاہ ڈی۔کے۔ڈبلو۔ خوب تیز چلاتے ہیں اور بس۔۔۔ آپ بھی تشریف لے جائیے۔ کیونکہ مسوری میں ہنی مون کے لیے سوائے میں ایک پورا سوٹ رزرو کرا لیا گیا ہے جس کے پیچھے سیب کے درختوں کا جھنڈ۔۔۔"

"اوہ!"

"اب تمھیں نیند آرہی ہے۔ اگر تم مجھے یاد کرو گی تو میں پھر کسی ایسی ہی چاندنی رات میں الٰہ دین کے دیو کی طرح تمھارے خواب میں آجاؤں گا۔ شب بخیر رخشندہ سلطانہ۔"

وہ اطمینان سے بنگلے پر سے کود کر باغ کے اندھیرے میں اتر گیا اور پھر اس کے قدموں کی چاپ سنسان سڑک کی خاموشی میں کھو گئی۔

"مہربانی سے ادھر ہی رہیے آپ۔۔۔"

۔۔۔ اور جم کو جواب تک یہ سوچ رہا تھا۔۔۔ جانے کیا سوچ رہا تھا

۔۔۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا برف کے سارے پہاڑ اور ساری چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی ہیں اور ان کے بوجھ میں دب کر وہ بے تحاشا خوب صورتی اور نفاست اور سجا ہوا کمرہ نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔

وہ سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی اور وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔۔۔ وہ جو۔۔۔ وہ جو۔۔۔ او خدا۔۔۔ "یہ مت سمجھو کہ میں fusses کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت!" یا اللہ۔۔۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ اسے اب تک رونا کیوں نہ آیا۔ نہ معلوم اسے کیا ہو گیا تھا۔ میرا بے چارا بچی۔ ہنی مون ختم ہوتے ہی سائیکلو انالسٹ سے اس کا علاج کرواؤں گا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

"اچھا کم از کم تم تو سو جاؤ۔ بہت تھک گئی ہو گی۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا اور وہ مخالفت کے بغیر ضدی بچے کی طرح مسہری پر گر گئی۔ وہ ٹہلتا رہا۔ اس رات اس نے سگریٹوں کا سارا ڈبہ ختم کر دیا۔ تکیوں میں منہ چھپا کر اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس نے سنا جیسے کہیں بہت دور سے آواز آرہی تھی۔ جم دریچے میں کھڑا کہہ رہا تھا:

"اس کا انجام تم نے کیا سوچا ہے؟"

قانونی علاحدگی۔۔۔ اس نے اپنے آپ کو کہتے پایا۔ پھر وہ سو گئی۔ جیسے اس نے دن بھر روتے روتے گزارا۔۔۔ اور بمباری یا زلزلے سے گری ہوئی عمارت کے ملبے سے نکلے ہوئے کسی زخم خوردہ انسان کی طرح وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔۔۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی برف جیسی پیشانی پر آگری تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جھک کر اس لٹ کو وہاں سے ہٹا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔۔۔ یہ اس کی بیوی تھی، رخشندہ۔۔۔ خدایا۔۔۔ اور وہ خود جم تھا۔۔۔ جمال انور۔۔۔ مائیکل انجلو کا شاہکار۔۔۔ او بلند و برتر خدا، کیا ہم سب پاگل ہیں۔ خواب گاہ کا تیز لیمپ رخشندہ پر اپنی کرنیں پھینکتا رہا۔۔۔ اس نے سبز روشنی جلائے بغیر اپنے آپ کو صوفے پر ڈال دیا۔

پھر وہ چار دوست خاموشی سے زینے پر سے اتر کے اس کار کی سمت بڑھے جو گیٹ وے کے اندھیرے سائے میں کھڑی تھی۔ اس پاگل کر دینے والی موسیقی کی گونج گیلریوں، اسٹالوں اور سمندری ہواؤں میں اب تک لرزاں تھی۔

مادام میگڈلین ریوبن جو فٹ لائٹ کی تیز کرنوں میں نہاتی ہوئی گا رہی تھی۔ اور کارل ریوبن جو پیانو پر بیٹھا تھا اور ہال جو الٹرا فیشن ایبل لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔۔۔ اور۔۔۔ انھوں نے سنا کہ کارل ریوبن اور مادام ریوبن اپنے آرکیسٹرا کے ساتھ جہاں جاتے ہیں شہرت اور عزت ان کے قدموں پر جھک

جاتی ہے۔ شمال کے سارے بڑے بڑے فیشن ایبل شہروں میں ان کے کونسرٹ ہو چکے ہیں۔ ریڈیو میں ان کے پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ اتحادی فوجوں کو محظوظ کرنے کے لیے ان کو خاص طور سے مدعو کیا جاتا ہے۔ مادام ریوبن، جو سیاہ یا نقرائی شام کے لباس میں چمکیلے پتھروں سے سجی ہوئی، خاموشی سے اپنے جیون ساتھی کے ہاتھ کا سہارا لے کر اسٹیج پر آتی ہے اور پھر ساری دنیا پاگل ہو جاتی ہے اس کے نغموں سے — اور انھیں تیزاب کی سی تلخی اور تیزی کے ساتھ یاد آیا۔ کارل کہا کرتا تھا: میرے ساتھ چلو مگ تمھیں بلبلوں اور کوئلوں کی ملکہ بنا دوں گا۔ مگیڈلین — مگیڈلین — میری سینورینا۔ گوا کی کالی راتیں تمھیں پکار کر واپس بلا رہی ہیں۔ راتوں کو تمھارے بالوں میں ستارے سجا کریں گے اور مہتاب کے مغنی کا گٹار بجتا رہے گا — تم — مگ — سرخ ہونٹوں والی چوہیا — تمھاری نیوریلجیا کی شکایت ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گی۔ تم میری آنکھوں سے دیکھو گی، میرے کانوں سے سنو گی، میرے جادو سے رقص کرو گی اور ساری کائنات مدہوش ہو کر ہمارے ساتھ ناچنے لگے گی۔ بے وقوف لڑکی جو ان چار سر پھرے ہندوستانی لڑکوں کے لیے کرافر مارکیٹ سے مچھلی کے ڈبے خرید کر لاتی ہو اور ان کی چائے کی پیالیاں صاف کرتی ہو۔ رب یہودہ کی قسم اس بھورے بالوں والی گلہری میں ذرا بھی عقل نہیں!

پھر انھوں نے سنا اتحادی فوجوں کو محظوظ کرنے والی ایک پارٹی کے ہم راہ مشرقِ وسطیٰ جاتے ہوئے جہاز پر ایک حادثے کی وجہ سے مسٹر کارل ریوبن کا انتقال ہو گیا اور خوب صورت اور غمگین مادام ریوبن پارٹی سے علاحدہ ہو کر اپنے وطن واپس چلی گئیں۔

اور ایک نیلگوں صبح گوا کے ایک چھوٹے سے ہرے بھرے قصبے کے پرانے اور بھورے پتھروں والے کیتھیڈرل میں جب ماس ختم ہونے کے بعد فادر فرانسیکو نے قربان گاہ کے دریچے کے سامنے کا پردہ برابر کیا تو ان کی پیشانی پر اور بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں ایک ملکوتی مسرت اور اطمینان کی روشنی چمک رہی تھی۔ کیونکہ ایک بھٹکی ہوئی روح آخر اپنے چرواہے کے پاس پہنچ چکی تھی — ''خداوند خدا کی رحمت ہو اس پر، وہ یسوع کی دلہن بن گئی —'' دعا کے آخری الفاظ بھورے پتھروں والے ہال کے منجمد سناٹے میں ڈوب گئے اور فادر ڈائیگو آرگن بند کر کے سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ باہر آسمان کے نیچے بہت سے ٹوٹے ہوئے نیلے پر ہوا میں تیرتے پھر رہے تھے۔

اور ایسی ہی ایک نیلگوں شام کے اندھیرے میں، جب کہ تاج کی ایک گالا نائٹ کے اختتام پر گیٹ وے، برساتی اور ٹیلریوں میں مجمع کم ہوتا جا رہا تھا، موٹریں اسٹارٹ ہو چکی تھیں اور اکا دکا لوگ سیڑھیوں اور سڑک کے کنارے سگریٹ جلانے اور اپنے دوستوں کو شب بخیر کہنے کے لیے رکے ہوئے تھے ان چار دوستوں نے اپنے پائوں کی راکھ جھٹکی اور ان کی سرخ کارڈھلوان پر بہنے لگی۔ رات گرم تھی اور رسوا اور جو ہو کی خاموش سڑکیں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

□□□

کلیات سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت -/138 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

بنگلور میں اردو اکادمیوں کی چھٹی کانفرنس ریاستی گورنر نے افتتاح کیا

● بنگلور۔ 6 جون، ریاستی گورنر مسٹر ٹی. این. چترویدی نے یہاں ہوٹل اے جے انٹرنیشنل میں ریاستی اردو اکادمیوں کی چھٹی کانفرنس کا افتتاح کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور کے زیر اہتمام منعقدہ اس دو روزہ قومی کانفرنس میں ملک کی کئی اردو اکادمیوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ریاستی گورنر مسٹر ٹی این چترویدی نے کہا کہ اردو کسی ایک فرقے کی زبان نہیں۔ اسے صرف مسلمانوں سے جوڑنا غلط ہے میرے والد اور چچا نے خود اردو کو پہلی زبان کے طور پر پڑھا ہے۔ اردو ہر لحاظ سے طاقتور زبان ہے اور اس کو سنوارنے سجانے میں تمام مذاہب کے لوگوں کا حصہ رہا ہے۔ مسٹر چترویدی نے کہا کہ اردو کے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیاں دور ہونی چاہئیں۔ انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ اردو کی پسماندگی کے لیے سرکار بھی ذمہ دار ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے یہ یقین دلایا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا مرکز بنگلور یا میسور میں قائم کرنے کو جگہ الاٹ کرانے کے بارے میں وہ وزیر اعلیٰ سے بات کریں گے اور کرناٹک اردو اکادمی کے سالانہ بجٹ میں اضافے کی بھی وہ حکومت سے سفارش کریں گے۔

جناب شمس الرحمن فاروقی وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اردو کی عظمت اور وراثت کو ہمیں اپنے عملی اقدام سے باقی بھی رکھنا ہے اور جاری بھی رکھنا ہے۔ یہ زبان اس ملک کی تہذیب اور تمدن کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ دانستہ اور غیر دانستہ طور پر یہ غلط فہمی عام ہوتی جارہی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جس کے ازالے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے مولد ہونے کا شرف ہر خطہ حاصل کرنے کی جستجو میں ہے۔ اردو کے بارے میں انگریزوں نے جو ہمیں پڑھایا، وہ ہم نے پڑھ لیا اور بے سمجھے دوسروں کو بھی وہی سکھاتے رہے۔ مثلاً یہی کہ اردو لشکری زبان ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اس زبان کو اردو کا نام گزشتہ دو سو برسوں میں دیا گیا ہے۔ لفظ اردو کے معنی تھے دلی شہر اور زبان اردو کا مطلب تھا شہر شاہ جہاں آباد کی زبان۔ نہ یہ فوجوں کی زبان ہے اور نہ باہر سے آئی ہے۔ شروع شروع میں اسے ہندوی، دکنی وغیرہ کا نام دیا گیا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک میں سولہ اردو اکادمیاں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اردو زبان کی اصل کے بارے میں سیمینار کریں اور دوسروں کے علاوہ خود اہل اردو کو بتائیں کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے۔ اگر اردو کا مطلب فوج کی زبان ہے تو مسلمانوں کی فوج ہزار سال پہلے یہاں آچکی تھی، آج اردو تیسری کیوں نہیں بن گئی۔ انھوں نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی ذہنیت کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب میں اردو اکادمی قائم ہوئی تو اسے مالیر کوٹلہ جیسی چھوٹی جگہ میں بند کر دیا گیا۔ کیوں کہ وہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔

استقبالیہ خطاب میں ڈاکٹر علی جاوید، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے کہا کہ اردو کو کسی خاص فرقے یا مذہب سے منسوب کر دینا زیادتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو غیر مسلم اکابر اس زبان کو مالا مال کر چکے ہیں ان کی ایک بڑی فہرست ہے، انھوں نے اردو کے مشہور غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں کے نام بھی لیے اور کہا کہ ان اکابر کے ذکر کے بغیر اردو کی تاریخ ادھوری ہے۔ موصوف نے مزید کہا کہ اردو کے تعلق سے خود اردو والوں کو ایک اہم رول ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ آتی جاتی حکومتوں پر کلی انحصار نے اردو کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مرکز کی سطح پر بھی اور صوبائی سطح پر بھی حکومتوں سے اپنے مطالبات منوانے کی کوششیں ضروری ہیں مگر جو کام ہمیں خود کرنے ہیں ان سے روگردانی کا کیا جواز ہے؟ نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج (NCPUL) کی مختلف سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک میں اردو کی فضا کو سازگار کرنے کے لیے ان کا ادارہ متحرک ہے۔ کرناٹک کے گورنر صاحب سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا کہ وہ اپنے ادارے کا ایک مرکز بنگلور یا میسور میں قائم کرنے کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کرناٹک میں اردو کی مقبولیت اور یہاں اردو بولنے والوں کے تناسب کے اعتبار سے کرناٹک اردو اکادمی کا بجٹ دیگر ریاستوں کے مقابلے میں بہت کم ہے جس میں اضافہ کیا جانا چاہیے۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں پریشان ہونے کی بجائے اردو کی بقا کے لیے ہر سطح پر عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر شیری لال ذاکر چیئرمین رابطہ کمیٹی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ ملک میں اردو کی ترقی کے لیے ایک سازگار فضا کی ضرورت ہے۔ ملک کے ہر حصے میں ہمیں ایسا ماحول پیدا کرنا چاہیے جہاں اردو کی ترقی آسان ہو۔ ملک کی تمام اردو اکادمیوں کے درمیان عملی رابطے کی ضرورت پر انھوں نے بہ طور خاص زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو پست ہمت ہونے کی ضرورت نہیں۔ جوش اور ولولے کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت کرناٹک کے وزیر برائے محنت و اقلیتی امور مسٹر اقبال انصاری نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے ہر سطح پر کوشش ضروری ہے۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو ماڈرن اسکولوں میں تعلیم دلانے کے ساتھ ساتھ اردو سکھانے کا بھی انتظام کریں۔ انھوں نے یہ یقین بھی دلایا کہ اردو کے فروغ کے لیے وہ ہر ممکن تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بہار اردو اکادمی کے وائس چیئر مین جناب شفیع مشہدی نے تمام اکادمیوں کے دساداروں کو یہ مشورہ دیا کہ پارلیمان میں رائٹ ٹو ایجوکیشن بل پیش کیا جانے والا ہے جس کے تحت 6 تا 14 سال کے بچوں کو تعلیم کا حق دیا جانے والا ہے۔ آپ سب کو اپنی جانب سے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ یہ تعلیم مادری زبان میں ہو۔ بل میں اس کو شامل کرنے کی درخواست کریں تو اردو کا بہت فائدہ ہوگا۔

کرناٹک اردو اکادمی کے چیئر مین پروفیسر م.ن. سعید کے شکریے پر افتتاحی اجلاس کا اختتام ہوا۔ کانفرنس کے دو روزہ اجلاس میں دہلی، جموں اور کشمیر، ہریانہ، آندھراپردیش، کرناٹک، مغربی بنگال، بہار اور پنجاب کی اردو اکادمیوں نے اپنی کارگزاریاں پیش کیں۔ کھلے اجلاس میں اردو کے فروغ میں حائل دشواریوں اور اکادمیوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں شہر کے اداروں اور مندوبین نے اظہار خیال کیا۔

کانفرنس کی پاس کی ہوئی قراردادیں اور کچھ دوسری تفصیلات اگلے شمارے میں ملاحظہ کریں۔

اردو کو ملک کی دوسری قومی زبان بنایا جائے

● فیض آباد، 29 مئی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے محمد نبی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک سیمینار ''اردو زبان کا فروغ تکنیکی پہلو'' کے عنوان پر پریس کلب کے ہال میں ہوا جس کی صدارت مشہور ہندی ادیب مدرا راکشس نے اور نظامت منظر مہدی نے کی۔ سیمینار کا آغاز محمد نام کے ایک بچے نے اردو پر ایک نظم پڑھ کر کیا۔ اس موقع پر صدر سیمینار مدرا راکشس نے کہا کہ آزادی سے قبل اردو پورے ہندوستان کی زبان تھی مگر آزادی کے بعد زبردستی ہندی کو راشٹر بھاشا بنا کر اردو کو مٹانے کی پوری کوشش کی گئی۔ اردو والوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ ہندی والوں نے ہی ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان اور ہندی تمام ہندوستانیوں کی زبان ہے۔ ہندی نے اس لیے ترقی نہیں کی کہ ہم ہندی والوں پر ایک بھاشا کو مٹانے کی کوشش کا پاپ ہے مگر اس کے باوجود اردو پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ اردو کا دوسرا نام تہذیب ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندی ادب جتنا غریب ہے اردو ادب اتنا ہی مالدار ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہندی ایک بھی ہندوستانی کی مادری زبان نہیں ہے بلکہ مادری زبان وہ 84 بھاشائیں اور 189 بولیاں ہیں جو ہندوستان میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس وقت سیاسی وجوہ سے اردو کو قومی زبان نہیں بنایا گیا تو اب اس کو پورے ہندوستان کی دوسری سرکاری زبان بنایا جائے۔

سماجی زبان کے لحاظ سے آج بھی اردو نمبر ایک پر ہے۔ اردو رابطہ کمیٹی کے ممبران پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو والوں نے ہی اردو کا زیادہ نقصان کیا جو جنگ آزادی کی مجاہد زبان کے غدار ہیں۔ اس موقع پر پرنسپل اختر صدیقی، ڈاکٹر طارق سعید، آفتاب رضا ایڈیٹ، محسن خاں، روشن تقی نے بھی خطاب کیا۔ رضی الدین صدیقی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام جلال صدیقی کی کنوینر شپ میں ہوا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو والے اپنی زبان کا حق ادا کریں

● حیدرآباد، 16 مئی۔ یوپی میں اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود اردو کی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہے۔ اس کی وجہ انتظامی سطح پر اردو کے لیے سرد مہری ہے۔ اردو کا معیار بھی گرتا جارہا ہے کیوں کہ تدریس کا نظام تشفی بخش نہیں ہے۔ یوپی میں ہندی کا چلن زیادہ ہے یہاں تک کہ مذہبی نوعیت کے جلسوں میں علما ہندی میں تحریر کر کے اردو میں تقریر کرتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے انجمن ترقی اردو کے تحت منعقدہ ایک خصوصی اجلاس میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ پالیسی اور عمل میں تضاد دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ہماری کوشش یہی ہوگی کہ پالیسی میں مندرج نکات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری محنت کی جائے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ میں ایک اردو کارکن کی حیثیت سے کام کروں گا جس کے لیے تمام اردو والوں کا تعاون ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے کلچر اور اپنی زبان کے تحفظ کے لیے سرکاری اداروں سے امیدیں وابستہ کرنے کی بجائے اپنے طور پر اقدامات کیے جانے ضروری ہیں۔ ابتدا میں جناب رحیم خاں معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھراپردیش نے ڈاکٹر علی جاوید کا خیر مقدم کرتے ہوئے انجمن کی علمی و ادبی کارکردگی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ جناب منوہر راج سکسینہ نے اردو زبان کی اہمیت و افادیت اور اس کی سرکاری حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے حکومتی اعلانات اور تجویزات کی صحیح انداز میں عمل آوری کے لیے کونسل سے مدد کی خواہش کی۔ پروفیسر یوسف کمال نے کہا کہ جن اسکولوں میں اردو تدریس کا انتظام ہے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور تدریس کے معیار کو بلند کیا جائے۔ اس نشانے کو پورا کرنے کے لیے کونسل کو باقاعدہ پلان تیار کر کے بلیادی سطح پر کام کرنا چاہیے۔ جناب کے. ایل. مہندرا نے اپنے خطاب میں کہا کہ اکثر اردو مدارس آہستہ آہستہ ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے مدارس کو مستحکم

اور کارگر بنانا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرپرستوں کو اس بات پر مائل کرنا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو مدارس میں شریک کریں۔ جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ نے حیدرآباد میں اردو تدریس کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے اردو اقامتی مدارس کی کارکردگی کے علاوہ دیگر اردو مدارس کی بہتر کارکردگی کے لیے تجاویز پیش کیں۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ یہ خیال غلط ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم حصول روزگار میں معاون نہیں۔ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہونی چاہیے اور بتدریج دوسری زبانوں میں مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل ہر گلی کوچے میں انگریزی میڈیم کے اسکول کام کررہے ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے یہ اسکول قابل اعتماد نہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے کہا کہ پروفیسر حبیب الرحمٰن کے قائم کردہ اردو میڈیم کے کالج میں کامرس اور اکنامکس کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ماں باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو زبان اور اردو تہذیب سے واقف کرائیں۔ اجلاس کے اختتام پر جناب نصرت محی الدین نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

اردو والوں کو بیدار ہونے کی ضرورت

● نئی دہلی، 12 جون۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے کہا ہے کہ اردو کے تمام مسائل حل کرانے کے لیے ہمیں ایک مشن اور تحریک کے طور پر کام کرنا پڑے گا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام اپنے اعزاز میں رکھی گئی ایک استقبالیہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی ترویج اور اشاعت کے لیے اردو والوں کو بیدار ہونے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید ایک فعال اور متحرک شخص ہیں اور ہمیں امید ہے کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے مختلف میدانوں میں کام کریں گے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید بہت ہی سیکولر، سرگرم اور غیر معمولی جدوجہد کرنے والے انسان ہیں۔ قومی کونسل کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر موزوں ہے۔ انھوں نے گنگا جمنی اردو تہذیب کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ یہ کام شروع سے بچوں کی ذہنی تربیت کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے اس کے لیے ہمیں بچوں کے ادب پر خاص توجہ دینی پڑے گی۔ جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید جس ادارے کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہیں اس میں بہت وسعت اور گنجائش ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اس ادارے کے توسط سے اردو کو مختلف میدانوں میں فروغ دینے کا کام کریں گے۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید بہت مقبول اور ہر دلعزیز شخصیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ علی جاوید مختلف سماجی اور سیاسی مسائل پر غور و فکر کرنے والے انسان ہیں، اس لیے ہمیں یقین ہے کہ وہ قومی کونسل میں اپنی چھاپ ضرور چھوڑیں گے۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ ڈاکٹر علی جاوید کی عمر کے بہت کم لوگ ہیں جو ان جیسی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ ایک ایسے ادارے سے وابستہ ہوئے ہیں جو ایک خودمختار اور ہندوستان میں سب سے بڑا علمی و ادبی ادارہ ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کونسل اور اردو اکادمی کو مزید فعال بنایا جائے گا

● نئی دہلی، 29 مئی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کا ایک ایسا ذیلی ادارہ ہے جسے اپنی کارکردگی میں خودمختاری حاصل ہے۔ یہی حیثیت صوبائی سطح پر دلّی اردو اکادمی کی ہے جو دلّی سرکار کا قائم کردہ ادارہ ہے۔ ان دونوں اداروں نے اپنے قیام سے اب تک اردو زبان، اردو ادب اور اردو ثقافت کے فروغ کے لیے قابل لحاظ کام کیا ہے۔ پچھلے دنوں ان دونوں اداروں کو مزید فعال بنانے پر ایک غیر رسمی محفل میں غور و خوض کیا گیا جو قومی اردو کونسل کے نئے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید کو خوش آمدید کہنے کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اس موقعے پر کئی اہم شخصیتیں موجود تھیں جن میں مرکزی وزرا جناب ایم. وی. راج شیکھرن، جناب سیف الدین سوز، جناب پرکاش جیسوال، جناب پون کمار بنسل، کے علاوہ دلّی کی وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت، ان کی کابینہ کے ساتھی جناب منگت رام سنگھل، کل ہند کانگریس کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری جناب پرویز ہاشمی، جناب اے. بی. بردھن اور ڈاکٹر عابد حسین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ میزبان مشہور سماجی شخصیت محترمہ نرملا دیش پانڈے تھیں۔

ان سرکردہ شخصیتوں کے درمیان اردو زبان کی ترویج و توسیع کے لیے اب تک کیے گئے اقدامات پر گفتگو ہوئی اور یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ اردو کونسل جو ملک گیر سطح پر سرگرم ہے اور دلی اردو اکادمی، جو صوبائی سطح پر کام کر رہی ہے، ان دونوں اداروں کی سرگرمیوں کو مزید کیا وسعت دی جاسکتی ہے اور ان کی کارگزاریوں کو کس طور پر اور زیادہ نتیجہ خیز بنایا جاسکتا ہے۔ یہ بھی طے ہوا کہ اس سلسلے میں آئندہ بھی مناسب موقعوں پر تبادلۂ خیال کیا جاتا رہے گا۔

تقریب تقسیم ایوارڈ اور انڈو پاک مشاعرہ

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی اور ضلع انتظامیہ پنچکولہ کے اشتراک سے اندردھنش آڈیٹوریم پنچکولہ میں ایک انڈو پاک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ اس

موقع پر ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے تقسیم ایوارڈ برائے سال 2007-2006 کی تقریب بھی منعقد کی گئی جس کا افتتاح ڈاکٹر اے. آر. قدوائی، گورنر ہریانہ نے کیا۔ جناب بھوپندر سنگھ ہڈا، وزیراعلا ہریانہ نے تقریب کی صدارت کی اور جناب پھول چند ملانا وزیر تعلیم ہریانہ بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

محترمہ نیر جا شیکھر (آئی اے ایس) ڈپٹی کمشنر پنچکولہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب کشمیری لال ڈاکر سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی نے اکادمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ضلع انتظامیہ پنچکولہ کے تعاون کی تعریف کی۔ اردو زبان و ادب کے فروغ اور ادیبوں اور قلمکاروں کی قدر افزائی کے لیے ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے بہت سے پروگراموں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ریاستی سطح کے ادیبوں کو نوازا جانا بھی اکادمی کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ برائے سال 07-2006 جو اعزازات گورنر ہریانہ ڈاکٹر اے. آر. قدوائی نے اپنے دست خاص سے عطا کیے ان میں اکادمی کا سب سے بڑا اعزاز حالی ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات اردو ادب کے نامور ادیب، شاعر اور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو دیا گیا جو ایک لاکھ روپے، شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے سماجی و ثقافتی خدمات دہلی یونیورسٹی دہلی کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اپن کنول کو دیا گیا جو پچیس ہزار روپے، شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ صابردت ایوارڈ برائے بہبودی خواتین جو پچیس ہزار روپے، شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے، ڈاکٹر سیدہ سیدین کی جانب سے پروفیسر کملیش موہن نے حاصل کیا کیونکہ ڈاکٹر سیدہ سیدین کسی وجہ سے تقریب میں شامل نہیں ہو سکی تھیں۔ سید مظفر حسین برنی ایوارڈ برائے اردو شاعری پروفیسر آزاد گلاٹی کو عطا کیا گیا جو اکیس ہزار روپے شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ خواجہ احمد عباس ایوارڈ برائے اردو نثر ڈاکٹر نصیر الدین ازہر کو پیش کیا گیا جو اکیس ہزار روپے شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ اردو فکشن میں غنی گمانی لال ایوارڈ جناب کدار ناتھ شرما کو دیا گیا جو گیارہ ہزار روپے، شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ انبالہ اور گردونواح میں اردو کے فروغ کے لیے سریندر پنڈت سوز ایوارڈ قاری محمد اسحٰق حافظ کو پیش کیا گیا جو ایک ہزار روپے، شال، ممنٹو اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ جو ایوارڈ پیش کیے گئے وہ جناب عاجز چالندھری اور جناب شانتی سروپ شان نے حاصل کیے۔ یہ اعزاز شال اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔ بیرون ملک اردو ادب کی خدمت کے لیے ایوارڈ جناب کل بھوشن پرواز کو دیا گیا۔ یہ اعزاز پانچ ہزار روپے شال، اور توصیفی سند پر مشتمل ہوتا ہے۔

ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے برائے سال 07-2006 اردو افسانوں کے مقابلے کا اہتمام کیا گیا۔ پہلی تین پوزیشن حاصل کرنے والے افسانہ نگاروں میں پہلا مقام ڈاکٹر سلطان انجم، دوسرا مقام جناب راجندر ورما اور تیسرا مقام جناب کیدار ناتھ شرما نے حاصل کیا۔ انھیں بالترتیب ساڑھے تین ہزار روپے ڈھائی ہزار روپے، دو ہزار روپے اور توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔ تقریب کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے انجام دیے۔

تقسیم انعامات کے بعد وزیر اعلیٰ ہریانہ جناب بھوپندر سنگھ ہڈا نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا آغاز کیا۔ جن شعرا نے مشاعرے میں شرکت کی ان کے اسمائے گرامی ہیں:

کشور ناہید، شمس الرحمٰن فاروقی، ملک زادہ منظور احمد، رفعت سروش، نواز دیوبندی، ملک زادہ جاوید، اشرف ساحل، ملکہ نسیم، حق کانپوری، نور جہاں ثروت، مہندر پرتاپ چاند، قاری محمد اسحٰق حافظ سہارنپوری، کل بھوشن پرواز، نفیس کانپوری اور کشمیری لال ذاکر۔

گیارھویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ — کا اجرا

● قطر کی عالمی شہرت یافتہ ادبی تنظیم ''مجلس فروغ اردو ادب'' کے زیر اہتمام ''گیارھویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ اور عالمی مشاعرہ 2007 بیاد مصیب'' کی تقریبات کا انعقاد گذشتہ ہفتہ انتہائی اعلیٰ پیمانے پر ہوا۔

''گیارھویں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ'' کی تقریب ''دانہ کلب، دوحہ'' میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کی نظامت کے فرائض فرتاش سید نے کامیابی سے سرانجام دیے۔

تقریب کے آغاز میں بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن، جو گذشتہ سال 12 اپریل کو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تھے، کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کی گئی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے صدارتی کلمات میں اردو ادب کے فروغ کے لیے بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا اور پروفیسر مغنی تبسم کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد پروفیسر مغنی تبسم نے Acceptance Speech کی اور مجلس کے لیے سپاس گزاری کا اظہار کیا۔ اس موقع پر پروفیسر مغنی تبسم کے دیرینہ ہمدم پروفیسر شہریار نے انھیں منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

اگلے روز مقامی فائیو اسٹار ہوٹل ''دوحہ شیراٹن'' کے بال روم آڈیٹوریم میں مختلف سفارتی سربراہان، قطری عمائدین، ہندو پاک سے تعلق رکھنے والے تجارتی اداروں کے سربراہان، مقامی ادبی و سماجی شخصیات اور ہزاروں حاضرین کی موجودگی میں موسیٰ زنیل موسیٰ مشیر کونسل آف آرٹس اینڈ کلچر حکومت قطر نے مجلس فروغ اردو ادب کی جانب سے ہندوستان کے معروف نقاد، محقق اور شاعر پروفیسر مغنی تبسم اور پاکستانی افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور گیت کار اسد محمد خان کو زبردست تالیوں کی گونج میں ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے نقد اور سونے

کے تمغوں پر مشتمل ''گیارھواں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ 2007 پیش کیا اور اس تقریب کے یادگاری مجلّے کی رونمائی فرمائی۔ ایوارڈ کے اجرا کی اس پروقار تقریب کے موقع پر مہمان اعزازی موسیٰ زنیل موسیٰ نے اپنے خطاب میں کہا کہ مجلس فروغ اردو ادب کی عالمی پیمانے کی تقریبات کے باعث دنیا کے ثقافتی اور ادبی نقشے پر قطر کا نام بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ آپ نے بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن کی ناقابل فراموش ادبی خدمات پر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ غالب، اقبال اور چند عربی و فارسی شعرا کا حوالہ دیتے ہوئے اسٹیج پر موجود شعرا سے مخاطب ہوئے اور انھیں خوش آمدید کہا جب کہ تلاوت کلام پاک کی سعادت قاری فخرالدین غازی نے حاصل کی۔

چیئرمین مجلس جناب محمد عتیق نے خطبۂ استقبالیہ میں حکومت قطر اور مالی تعاون کرنے والے تمام اداروں کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بانی مجلس ملک مصیب الرحمٰن کی مجلس کے لیے خدمات اور ان کی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کیا اور کہا کہ بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا مجلس کی تقریبات انعقاد پذیر ہوتی رہیں گی تو میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر میرے Sponcers، رفقائے کار اور دوست دست تعاون دراز کرتے رہے تو انشاء اللہ یہ تقریبات باوقار طریقے سے منعقد ہوتی رہیں گی۔

''عالمی مشاعرہ 2007 بیاد مصیب'' کی صدارت ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کی جس میں ہندوستان سے پروفیسر شہریار، مغنی تبسم، ندا فاضلی، معراج فیض آبادی، ش ک نظام، پاپولر میرٹھی، گروندر سنگھ کوہلی عازم، طارق قمر، شبینہ ادیب اور ہندوستان میں مجلس کے رابطہ آفیسر کفایت دہلوی کے علاوہ پاکستان سے امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، انور شعور، اسد محمد خاں، عزم بہزاد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، تیمور حسن تیمور، فرتاش سید اور تبسم صدیقی صاحبہ نے شرکت فرمائی۔ امجد علی سرور اور شوکت علی ناز نے مقامی شعرا کی نمائندگی کی جب کہ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ تمام شعرا نے اپنا منتخب کلام پیش کر کے خوب داد حاصل کی، سامعین نے انتہائی توجہ و انہماک سے سنا اور ہر اچھے شعر پر کھل کر داد دی۔ صدر مشاعرہ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے صدارتی کلمات میں مشاعرہ کو تزکیۂ نفس کا ذریعہ قرار دیا اور کہا کہ بعض ممالک میں شاعری سے علاج کیا جاتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس مشاعرے میں اعلیٰ درجے کا کلام پیش کیا گیا اس اعتبار سے یہ ایک کامیاب مشاعرہ ہے۔ مشاعرے کے اختتام پر شعرائے کرام میں یادگاری شیلڈ ''لوح سپاس'' پیش کی گئیں۔

ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے زیر اہتمام عالمی سیمینار

● لکھنؤ، 30 رمئی، ہندی اردو ساہتیہ ایورڈ کمیٹی کے زیر اہتمام اٹھارھواں بین الاقوامی سیمینار اس بار ہندی کے مشہور افسانہ نگار راجندر اوستھی اور اردو کے معروف فکشن نگار کرشن چندر کے حوالے سے ہوا۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر وارث کرمانی نے کی۔ انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کرشن چندر کے فن اور شخصیت پر گفتگو کی۔

سیمینار میں پاکستان سے آئے ہوئے پروفیسر رئیس علوی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ آج کے حالات میں کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں کی اشد ضرورت ہے، جن کی تحریروں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پل کا کام کیا ہے۔

سیمینار کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ افسانے کی تاریخ میں کرشن چندر اس اعتبار سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کئی تجربے کیے مثلاً ''ان داتا'' جس میں انھوں نے پہلی بار Three Dimensional تکنیک سے کام لیا۔ ''غالیچہ'' میں تجریدی آرٹ سے کام لیا۔ ''آدھے گھنٹے کا خدا'' ہو یا ''ایک گدھے کی سرگزشت'' ان کی ہر تحریر ایک نئے ذائقے اور تجربے کا پتہ دیتی ہے۔ کرشن چندر کا کمال یہ ہے کہ اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی پانچ دس سال میں ہی انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر ڈالی۔ مثلاً 1936 میں پہلا افسانہ ''یرقان''، 1937 میں پہلا ریڈیائی ڈرامہ ''بے کاری''، 1937 میں پہلا انشائیہ ''نوائے قلق''، 1938 میں اقبال کی نظموں کے انگریزی تراجم، 1943 میں پہلا ناول ''شکست''، 1943 میں فلم سازی، 1945 میں رپورتاژ یعنی ''پودے''۔ میرٹھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے مقالے بعنوان ''رومانیت، اردو افسانہ اور کرشن چندر کی انفرادیت'' میں رومانیت خارجی اقدار کو باطنی اقدار سے اس طور پر ہم آہنگ کر دیتی ہے کہ دونوں اقدار کی آمیزش نیا مزہ دیتی ہے اور قاری خود کو افسانے میں شریک محسوس کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر صغیر افراہیم نے کرشن چندر کے اولین ناول ''شکست'' سے بحث کی اور کہا کہ ''شکست'' کے ذریعے دراصل کرشن چندر نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ حسن فطرت سے مالامال ''جنت نشاں''، ''جہنم زار'' کی شکل کس طرح اختیار کرتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے پروفیسر قدوس جاوید کے مقالے کا عنوان ''کرشن چندر: خط منحنی کا اضافہ نگار'' تھا۔ انھوں نے کہا کہ کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ذریعے ایک نئی مایتھولوجی ترتیب دی ہے۔ یہ مایتھولوجی سادہ، سیکولر اور تعمیری ہے، جس کے مرکز میں دیوی دیوتا یا فرشتے نہیں عام لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ فجی سے آئے اسکالر ڈیونیل نرائن نے کرشن چندر کی شخصیت پر گفتگو کی تو امریکہ کے اسکالر ٹیلر ولیمس نے کرشن چندر کے رپورتاژ کی خوبیاں بیان کیں۔ پروفیسر شاہد حسین شعبۂ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے کرشن چندر کی ڈراما نگاری پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ دراصل ان کے افسانوں کا سایہ ڈرامے پر نظر آتا

ہے ورنہ ان کے یہاں ایک اچھے ڈراما نگار کی خوبیاں ملتی ہیں۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ کرشن چندر واحد ترقی پسند افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کی توسیع اس طرح کی کہ اس میں رومانی عنصر بھی شامل کر دیا۔ اس طرح انھوں نے سپاٹ حقیقت نگاری میں ایک خوش گوار تاثر پیدا کر دیا۔ ان کی دوسری خوبی جسے ان کی انفرادیت کہا جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو نئی نئی تکنیکوں سے متعارف کرایا۔ آگے چل کر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ان کا یہ تجربہ بہت مقبول ہوا۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی اس نوع کے تجربوں کے ذریعے اردو افسانے میں نئی معنوی جہات پیدا کیے۔ اس موقع پر عابد سہیل، پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر آفتاب احمد وغیرہ بھی موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان ممبئی کے اعزاز میں سیمینار اور شعری نشست

● ممبئی۔ 23 مئی، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ایک باوقار ادارہ ہے جو ہندوستانی زبانوں کے ادبیات کے فروغ کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ شاعروں اور قلم کاروں کے اہم کاموں کی پذیرائی کرتا ہے اور انھیں قومی ایوارڈ سے نوازتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو کے معروف طنز و مزاح نگار یوسف ناظم نے شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام اس سیمینار کے صدارتی خطبے میں کیا جو ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ ممبئی کے اردو ادبا و شعرا کے اعزاز میں 19 مئی 2007 کو جے پی نائک بھون میں منعقد ہوا تھا۔

معتبر اور معمر ادیب یوسف ناظم نے سیمینار کے منفرد اور انوکھے موضوع کی تعریف کی اور ساہتیہ اکادمی کے انعام یافتگان ممبئی (اردو) پروفیسر عبدالستار دلوی، ندا فاضلی، سلام بن رزّاق، ساجد رشید، خالد اکاسکر اور وقار قادری کو مبارک باد دیتے ہوئے اکادمی کے قیام اور ہندوستانی ادبیات کے فروغ میں اس کے رول اور دائرۂ کار پر روشنی ڈالی۔

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ قلم کاروں نے اپنے تخلیقی تجربے یا ترجمے کے تجربے سے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے ترجمے کے تعلق سے کہا کہ مجھے مراٹھی کے معروف اسکالر ستو مادھوراؤ پگڑی اور رابھی جوشی سے ترجمہ کرنے کی تحریک ملی۔ ترجمہ براہِ راست ہو یا بالراست، اس عمل سے ذہنی افق روشن ہوتا ہے۔

سلام بن رزاق نے اپنے تخلیقی تجربے، پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں مالی منفعت کے لیے ڈراما، ڈائیلاگ اور اسکرپٹ وغیرہ لکھتا ہوں مگر میں بنیادی اعتبار سے ایک افسانہ نگار ہوں اور افسانہ رقم ہو جانے پر مجھے جو دلی مسرت ہوتی ہے وہ دوسری تحریروں سے نہیں ملتی۔ ساجد رشید نے کہا کہ جب میں نے مراٹھی ناول ''جھاڑ اجھرتی'' پڑھا تو یہ مجھے ایک اچھا ناول لگا۔ اس کو میں اردو میں منتقل کرنے لگا تو بہت سارے مراٹھی الفاظ کے ساتھ مجھے جوجھنا پڑا، لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ ایک اچھا ترجمہ ہو گیا۔ خالد اکاسکر نے ترجمے سے متعلق کہا کہ اردو کی طرح مراٹھی لکھتا، پڑھتا اور بولتا ہوں۔ اس لیے میں نے مراٹھی کہانیوں کا انتخاب ''کتھا'' کا براہِ راست اردو ترجمہ کیا جو کافی پسند کیا گیا اور اس کامیاب ترجمے پر مجھے ساہتیہ اکادمی کا قومی ترجمہ ایوارڈ ملا تو اس وقت میں اپنی محنت پر اس لیے خوش ہوا کہ محنت کی مزدوری ہر کسی کو نہیں ملتی۔

ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان ممبئی پر مقالہ نگاروں نے مقالے پیش کیے، محمود ایوبی نے ساجد رشید کی شخصیت اور ان کی ترجمہ نگاری پر مقالہ پڑھا۔ انور قمر نے سلام بن رزاق کی افسانہ نگاری کی فنی خوبیوں کا احاطہ کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی شخصیت اور ان کی ترجمہ نگاری پر محمد ایوب واقف نے مقالہ پیش کیا۔ ندا فاضلی کی شاعری کا مختصراً احاطہ کرتے ہوئے عبدالاحد ساز نے ''ندا فاضلی کی شاعری: منظر، کیفیت اور احسا کی تجسیم'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ''خالد اکاسکر اور کتھا کا درپن'' کے عنوان سے محمد حسین پرکار کا مقالہ جامع تھا جبکہ ڈاکٹر قاسم امام نے وقار قادری پر ایک اچھا خاکہ پیش کیا۔

سیمینار کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب علی، صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبے کی فعالیت کا ذکر کیا اور سیمینار کی غرض و غایت بیان کی، نیز ساہتیہ اکادمی انعام یافتگان، ممبئی (اردو) کی اہم خدمات کو مختصراً اجاگر کیا اور انھیں مبارک باد دی۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض پروفیسر الیاس شوقی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر افسر فاروقی کے شکریے کے کلمات پر سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

اس کے بعد انعام یافتگان کے اعزاز میں معروف شاعر ممتاز راشد کی صدارت میں ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا۔ شہر ممبئی اور اطراف کے مشہور شعرا میں عبدالاحد ساز، احمد وصی، مختار احسن انصاری، شفیق عباس، شمیم عباس، عارف اعظمی، قاسم امام، سید ریاض، جاوید ندیم، عبید اعظم اعظمی، شعور اعظمی، عزیز نبیل اور مقصود بستوی وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔ شعری نشست کی نظامت کے فرائض عرفان جعفری نے انجام دیے جبکہ شکریے کی رسم ڈاکٹر صاحب علی، صدر شعبۂ اردو نے ادا کی۔

(ڈاک سے)

مسلم یونیورسٹی میں سیلف لرننگ میٹیریل ورکشاپ

● علی گڑھ۔ 16 مئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز برائے فاصلاتی تعلیم کے زیر اہتمام سیلف لرننگ میٹیریل پر تین روزہ نیشنل ورکشاپ کا افتتاح کرتے ہوئے اترانچل اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایس. ایس. حسن نے کہا کہ ہندوستان اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بہت پچھڑا ہوا ہے اور اب

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ سے فاصلاتی نظام تعلیم ایک متبادل کے طور پر اعلیٰ تعلیم کے تقاضوں کو پورا کررہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی آزادی کے ساٹھ سال بعد بھی ہندوستان میں محض آٹھ فیصد لوگوں کو ہی اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم ہیں جبکہ جنوبی کوریا میں 85 فیصد، امریکہ میں 65 فیصد اور کناڈا میں پچاس فیصد سے زائد نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل ہیں۔ یونیورسٹی کی پریس ریلیز کے مطابق پروفیسر حسن نے کہا کہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں میں جس تناسب سے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اس تناسب سے اساتذہ اور بنیادی ڈھانچے کو فروغ حاصل نہیں ہورہا ہے اور تعلیم کا معیار بھی بلند نہیں ہو پارہا ہے جبکہ معیاری تعلیم ملک کی بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتراکھنڈ کے بعض کالجوں میں ایک ایک کلاس میں سو سو طلبہ کے نام درج ہیں اور ایک استاد طالب علموں کو کیا پڑھا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب طلبہ تعلیمی مواد کی فراہمی پر زور دیتے ہیں اور پاس ہونے کے لیے کنجی کا استعمال کرتے ہیں۔ پروفیسر حسن نے کہا کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کی وجہ سے فاصلاتی نظام تعلیم کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور علم حاصل کرنے کے لیے اب روایتی تعلیم کے علاوہ فاصلاتی تعلیم ملٹی میڈیا سے مہیا ہورہی ہے جس میں کلاس روم اور ٹیچر کی کوئی قید نہیں ہے۔ افتتاحیہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایم۔ سلیم الدین نے کہا کہ عالمگیریت کے اس دور میں تعلیم کی اہمیت میں بھی روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ روایتی تعلیمی نظام نے بھی غیر معمولی ترقی کی ہے مگر سماج کے کمزور طبقات اور پسماندہ علاقوں میں تعلیم کے مواقع فراہم کرانے کے لیے فاصلاتی نظام تعلیم بھی اب اہم رول ادا کررہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک ممتاز ادارہ ہے اور اس ادارے کے پاس وسائل انسانی کی کمی نہیں ہے اور یہاں کا بنیادی ڈھانچہ بھی بہت مضبوط ہے اور یہ سینٹر فروغ علم کے میدان میں خاطر خواہ پیش قدمی کررہا ہے۔ اس سے قبل فاصلاتی تعلیم کے مرکز کے ڈائرکٹر پروفیسر ایس۔ ایس۔ امتیاز حسین نے مندوبین کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حسن خود بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم رہ چکے ہیں اور وہ ایک سائنس داں کے طور پر مشہور ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس سینٹر کے زیر نگرانی گیارہویں اور بی۔ اے۔ کے کورس پہلے ہی شروع ہوچکے تھے اور گزشتہ سال سے بی لب اور صحافت کا کورس بھی شروع کردیا گیا ہے اور نئے تعلیمی سال سے بعض نئے پیشہ ورانہ کورس بھی شروع کیے جارہے ہیں جن میں پی۔ جی۔ ڈپلوما ان پورٹ فولیو مینجمنٹ، پی۔ جی۔ ڈپلوما ان گائیڈینس اینڈ کاؤنسلنگ، پی۔ جی۔ ڈپلوما ان اسٹریس مینجمنٹ شروع کیے جارہے ہیں۔ بی۔ کام۔ کورس شروع کرنے پر بھی غور کیا جارہا ہے۔ ساتھ ہی ملک بھر میں کئی مطالعاتی مرکز بھی قائم ہوگئے ہیں۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

مولانا آزاد لائبریری کے نادر مخطوطات سائنٹفک طریقے سے محفوظ

● علی گڑھ۔ 16 مئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری مولانا آزاد لائبریری میں موجود 14 ہزار 799 نادر مخطوطات کو پہلی مرتبہ سائنٹفک تکنیک سے محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ عمل تحفظ حکومت ہند کے قومی مخطوطات مشن کے زیر اہتمام مولانا آزاد لائبریری کو مخطوطات تحفظ معاون مرکز (ایم سی پی سی) قرار دیے جانے کے بعد مکمل کیا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے لائبریرین جناب شکیل احمد خاں نے بتایا کہ مخطوطات کے تحفظ کا کام گزشتہ 15 جنوری سے شروع ہوا اور 15 مئی کو اختتام پذیر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ ان مخطوطات میں شعبۂ سنسکرت کے 218 مخطوطات بھی شامل ہیں جو تاریخی اور نہایت ہی نادر ہیں۔ جناب شکیل احمد خاں نے بتایا کہ طبیہ کالج سمیت یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جات میں موجود مخطوطات کو بھی مولانا آزاد لائبریری لانے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ ان کا جدید اور سائنٹفک طریقے سے تحفظ ممکن ہوسکے۔ مولانا آزاد لائبریری میں اردو، عربی، فارسی، ہندی، تیلگو اور ملیالم زبان کے نادر مخطوطات میں اسلام کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کا کوفی خط میں ہاتھ سے تحریر کردہ ''قرآن شریف''، شریف الرازی کی ایڈٹ کی ہوئی ''نہج البلاغہ''، ولی اللہ فرنگی محلی کی لکھی قرآن کریم کی تفسیر، ابوالفضل اور فیضی کے مہابھارت، بھگوت گیتا، مہابھارت اور لیلاوتی کا فارسی ترجمہ، چاول کے دانے پر تحریر کردہ سورۂ اخلاص، چاول کے دانے پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی تصویر، مغلیہ عہد کے کرتے پر لکھا مکمل قرآن اور اورنگ زیب کا ہاتھ سے تحریر کردہ قرآن خصوصی طور پر شامل ہیں۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

بزم ادب خواتین علی گڑھ کی خصوصی نشست

● علی گڑھ، 27 مئی۔ بزم ادب خواتین کی ایک خصوصی نشست ''شام افسانہ'' بیگم عطیہ عابدی کی جانب سے منعقد کی گئی جس میں بزم خواتین کی تمام ارکان کے علاوہ مہمان خواتین قلم کار بیگم نمرتا کنور پال سنگھ، بیگم سیمی ابرار، سمیع رفیق، ڈاکٹر زویا زیدی اور پروفیسر زاہدہ زیدی موجود تھیں۔

آغاز نشست تلاوت و ترجمۂ قرآن پاک سے کیا گیا۔ بزم کی سکریٹری راشدہ خلیل نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور تعارف کرایا۔ کہانی کار نمرتا سنگھ سے ان کی کہانی ''گھر'' سنی گئی۔ نمرتا سنگھ ہندی کی مشہور افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیاں ہندو بیرون ہند ریڈیو، ٹی وی پر اکثر نشر ہوتی رہتی ہیں۔ ''گھر'' ایک ایسے پسماندہ خاندان کی کہانی ہے جو عورت پر ظلم اور جبر کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ کہانی اچھی اور متاثر کن تھی۔

سیمی ابرار نے ایک کہانی ''رنگین پرزہ'' پڑھ کر سنائی۔ یہ بے حد پُر اسرار سی کہانی تھی جس کے اختتام تک پہنچنا مشکل تھا۔ مگر انجام حیران کن تھا۔ بہت ہی گہری کہانی تھی۔ محترمہ سیج رفیق نے ایک کہانی انگریزی سے ترجمہ کر کے سنائی ''پراسرار مسافر'' بہت ہی عمدہ کہانی۔ محترمہ رفیق ہمیشہ انگریزی میں کہانی لکھتی ہیں مگر اردو سے لگاؤ بہت ہے۔ کہانی کا تھیم بہت اچھا تھا۔ مہمان قلم کاروں کے اعزاز میں بیگم آصف اظہار علی نے اور غزالہ قمر نے اپنی کہانی ''اندھیرا اجالا'' اور ''مقبرہ'' پڑھیں۔ بیگم زاہدہ زیدی نے اپنا ایک نیا ڈراما سانحہ گجرات پر لکھا ہوا سنایا۔ اس نشست کے دوسرے دور میں ڈاکٹر زویا زیدی نے اپنی دو نظمیں سنائیں اور پروفیسر زاہدہ زیدی نے ایک غزل پیش کی۔ اس طرح یہ ایک یادگار نشست ثابت ہوئی۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

سید حامد کا ذاتی کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ہدیہ

● نئی دہلی۔ 11 مئی، سید حامد، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور موجودہ چانسلر جامعہ ہمدرد نے اپنی کتابوں کا ذخیرہ جو تقریباً ساڑھے تین ہزار کتابوں پر مشتمل ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو نذر کر دیا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لائبریرین شکیل احمد صاحب نے چودھری احرار الحق صاحب کے ذریعے ان کتابوں کو تعلیم آباد، سگم وہار، نئی دہلی سے ایک گاڑی بھیج کر علی گڑھ منتقل کر دیا۔ ان کتابوں میں فارسی، انگریزی، عربی، اردو اور ہندی کی کتابیں شامل ہیں۔ سید حامد کی اس پیش کش کو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور لائبریرین نے بصد احترام قبول کیا ہے اور ''سید حامد کلکشن'' کے عنوان سے مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

اقلیتوں کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مالی امداد

● کولکاتہ۔ 25 مئی، اقلیتی فرقے کے طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اب مالی امداد فراہم کی جائے گی، یہ قدم مرکز کی صلاحیت اور وسائل کی بنیاد پر اسکالرشپ اسکیم کی تجویز کے پیش نظر اٹھایا گیا ہے۔

مرکز کی اس اسکیم کے تحت اقلیتی فرقوں کے طلبہ کو ہر سال 20 ہزار اسکالر شپ دی جائے گی تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ وزیر خزانہ پی چدمبرم نے 2006-07 کی اپنی بجٹ تقریر میں اس اسکیم کا اعلان کیا تھا۔ اسکیم کے مطابق تسلیم شدہ تعلیمی اداروں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند طلبہ کو یہ مالی امداد دی جائے گی۔ اقلیتی امور کی وزارت کی سالانہ رپورٹ (2006-07) میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی حوصلہ افزائی ہے تاکہ اقلیتی فرقوں میں بھی پیشہ ور پیدا ہوں اور تکنیکی ماہرین نکل کر آئیں اور اس طرح روزگار کی منڈی تک ان کی رسائی ہو۔ اس خصوصی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایکسپینڈ پیچر فنانس کمیٹی کی سفارش کردہ یہ اسکیم ریاستی حکومت اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے ذریعے عمل میں لائی جائے گی۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

مختصرات

● سیتاپور، بزم اردو سیتاپور کے زیر اہتمام ایک پروگرام پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ پر منعقد ہوا۔ اس تقریب کی صدارت معروف شاعر اور صحافی حفیظ رحمانی نے کی اور نظامت کے فرائض رضوان خاں نے انجام دیے۔ حفیظ رحمانی نے کہا کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کو غدر کہنا مناسب نہیں ہے، اس کو جنگ آزادی ہی کہنا چاہیے۔ غاصب برطانوی حکمرانوں کو اپنے وطن سے نکالنے کی کوشش غدر نہیں کہی جا سکتی ہے بلکہ یہ تو ہمارا حق تھا کہ ہم وطن عزیز کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مجاہدہ کریں۔ رضوان خاں نے کہا کہ پہلی جنگ آزادی سے لے کر 1947 تک تحریک آزادی میں مسلم علما اور مسلم عوام نے جو قربانیاں دی ہیں انھیں بھلانا نہیں چاہیے۔ مسلمانوں کی حب الوطنی اور قوم کے لیے کی جانے والی خدمات کا سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے اور انشاء اللہ یہ روایت ہمیشہ قائم رہے گی۔ دیگر مقررین میں اشتیاق علی صبا، بابو صادق علی، ابوالمجاہد سلیم اختر، عمران سیتاپوری، عارف محمد عارف، کے نام شامل ہیں۔ نعیم خان نے بھی کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● پٹنہ 3 جون۔ خدا بخش لائبریری میں 3 جون کی شام اردو کے نامور شاعر جناب اظہر عنایتی کے ساتھ ایک شام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، ڈین اسٹوڈنٹ ویلفیئر پٹنہ یونیورسٹی نے کی اور صدارت اردو کے مشہور شاعر جناب شمیم فاروقی نے فرمائی۔

ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے شعرائے کرام اور سامعین کا استقبال کرتے ہوئے جناب اظہر عنایتی کی شخصیت سے لوگوں کو متعارف کرایا اور کہا کہ اظہر عنایتی زندگی کی سچائیوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عصری حالات و حادثات اور شخصی تجربات و مشاہدات کو نئے اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب اظہر عنایتی نے پروگرام کے آغاز میں کچھ اپنے متعلق اور کچھ اپنی شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ جناب اظہر عنایتی کے کلام کے بعد صدر مجلس جناب شمیم فاروقی نے اپنے

ارشادات سے نوازا اور اپنی کچھ غزلیں بھی پیش کیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے شعرائے کرام اور سامعین مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● غازی پور۔14اپریل، مظہر میموریل اردو لائبریری، بکری آباد، غازی پور کے زیر اہتمام مورخہ 14 اپریل 2007 کو قومی نسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے ''قومی یکجہتی سیمینار برائے فروغ اردو'' کا انعقاد ہوا۔ جس میں مشرقی اتر پردیش کے بہت سے ادیبوں، صحافیوں اور سرکردہ رہنماؤں نے شرکت کی۔ لائبریری کے سکریٹری احتشام الدین صدیقی نے صدر محفل اور تمام حاضرین کا خیر مقدم کیا۔ ساتھ ہی قومی یکجہتی کے موضوع پر چند اشعار بھی پیش کیے۔ شفیق الزماں، ڈی وائی سی وزارت فلاح نو جوانان بھارت سرکار نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے حق کی جنگ اکثر ہندوؤں نے لڑی ہے اور مسلمان ہندوؤں کے پاسدار رہے ہیں۔ آپسی محبت و اخوت سے ملک بلند ہوگا۔ اگر باہمی نفاق کی کھائی کو پاٹ دیا جائے تو ایسی یکجہتی قائم ہوگی جو ساری دنیا کے لیے ایک مثال ہوگی۔ اپنے صدارتی کلمات میں ڈاکٹر برج ناتھ سہائے نے کہا کہ میں فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر ہربنش رائے بچن کا شاگرد رہا ہوں۔ ان لوگوں کے ماحول میں میں نے قومی یکجہتی کا بھر پور جذبہ دیکھا ہے۔ قومی یکجہتی کے بل پر ہم معاشرے کو بدل سکتے ہیں۔

لکھنؤ سے تشریف لائے ڈاکٹر عبدالکلام نے کہا کہ آج ہندوستان کے سامنے جہاں غریبی، ناخواندگی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل ہیں وہیں قومی یکجہتی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات نہ صرف قومی بربادی کا سبب ہیں بلکہ ان سے ہماری گنگا جمنی تہذیب متاثر ہو رہی ہے اور دنیا میں ہماری رسوائی ہو رہی ہے۔

سیمینار کی نظامت کی ذمے داریاں قمر اعظمی نے انجام دیں۔ سیمینار کے معاونوں میں مولانا محمد طلحہ، اصعت پرکاش ورما، امت سہائے، شمیم احمد صدیقی، سید امام، اجے سہائے، فیاض احمد صدیقی، قاضی اکرام اللہ، روی ناتھ سہائے، مقرر عباسی وغیرہ خاص تھے۔

آخر میں ادارے کے صدر محمود عالم نے کہا کہ اس قومی یکجہتی سیمینار میں بہت قیمتی اور گراں قدر خیالات سامنے آئے جن پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(ڈاک سے)

● بھساول۔ 16 مئی، انجمن ادب بھساول کے زیر اہتمام ضلعی سطح پر افسانوی نشست کا انعقاد ہوا۔ نشست کے آغاز میں آرگنائزر احمد کلیم فیض پوری نے تمام مہمانوں اور افسانہ نگاروں کا استقبال کیا اور بھساول کی ادبی تاریخ خصوصاً مشاعروں کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ انھی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے بھساول کو ''شہر ادب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جناب احمد کلیم فیض پوری نے مزید فرمایا کہ نئے قلمکاروں کو منظر عام پر لانے کے لیے اس طرح کی نشستوں کا انعقاد نہایت ضروری ہے۔

افسانوی نشست کے صدر معروف افسانہ نگار معین الدین عثمانی نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے خاندیش میں اردو افسانے کی موجودہ صورتحال کو غیر اطمینان بخش قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ بڑے اور شاہکار افسانوں کی تخلیق کے لیے محنت و ریاضت اور مطالعہ ضروری ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ان چیزوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ انھوں نے احمد کلیم فیض پوری کو نشست کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے دوسرے علاقوں کے لیے قابل تقلید قرار دیا۔ اس نشست میں شکیل احمد (بیاول) نے ''ضمیر کی آواز'' صغیر احمد نے ''شناخت'' سید ذاکر حسین (ارنڈول) نے ''جان کی قیمت'' وحید امام (جلگاؤں) نے ''ممتا'' معین الدین عثمانی (جلگاؤں) نے ''سمجھوتہ'' قریشی جلال (کھڑگاؤں) نے ''گالی'' اور احمد کلیم فیض پوری نے ''واہمہ'' کے عنوانات سے افسانے پڑھے۔ اس موقع پر شکیل حسرت، ذاکر حسین ذاکر اور حسین پائلٹ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ صابر شیخ (سابق میونسپل کاؤنسلر) اور سلیم انجینئر صاحب نے بھساول میں ایسی دلچسپ اور معیاری نشست کے انعقاد پر خوشی کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض ایس۔ایم۔انور نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 21 مئی۔ جے این یو کلچرل فورم کے زیر اہتمام جہلم لان میں کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت پدم شری ڈاکٹر بشیر بدر نے کی۔ عبدالعلی عزیزی اور فلم ساز مظفر علی بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔ ''ہندوستانی زبانوں کا مرکز'' کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے مشاعرے کی شمع روشن کی۔ مشاعرے کے کنوینر عرفان قدوسی نے شعرا اور حاضرین کا استقبال کیا۔ نظامت ڈاکٹر کمار وشواس اور شکیل حسن شمسی نے کی۔ عبدالمغنی نے کلمات تشکر ادا کیے۔

شعرا حضرات میں بشیر بدر، فصیح اکمل، نظر ایٹوی، پروفیسر عین الحق، حسن کاظمی، ممتاز نسیم، آصف نظر، معین شاداب، اقبال اشہر، عمیر منظر، شکیل حسن شمسی، کمار وشواس کے علاوہ ساغر خیامی، نزہت امروہوی، شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● حیدرآباد، 30اپریل۔ ممتاز افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو نے کہا کہ آج کل حکومت کی جانب سے تشکیل کردہ اردو اکادمیوں میں اردو کے ادیب نظر نہیں آتے۔ ایسے افراد کو یہ عہدے دیے جا رہے ہیں جن کا اردو سے کوئی

تعلق نہیں ہوتا۔ اکادمیاں برسراقتدار پارٹی کی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کی جارہی ہیں۔ ایسے حالات میں اردو انجمنوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔ محترمہ نے انجمن ترقی اردو آندھراپردیش کے زیراہتمام منعقدہ ایک تہنیتی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ یہ اجلاس شہر حیدرآباد کی تین ممتاز علمی شخصیتوں کو انجمن ترقی اردو کی اعزازی رکنیت عطا کرنے کے ضمن میں اردو ہال، حمایت نگر میں منعقد ہوا تھا۔ یہ رکنیت محترمہ جیلانی بانو، جناب مجتبیٰ حسین اور پروفیسر محسن عثمانی ندوی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جناب مجتبیٰ حسین نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات اردو کے لیے بہتر نہیں ہیں۔ ہر سطح پر اردو کے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے اور اردو اداروں پر ایسے لوگ قابض ہیں جن کو اردو کی ترقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمان صدر انجمن ترقی آندھراپردیش نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو کے نامور ادیبوں کو اعزازی رکنیت دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے انجمن کو ان دانشوروں کا تعاون حاصل ہو۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ بھی حیدرآباد کی ممتاز شخصیتوں کو اعزازی رکنیت دی جائے گی۔ پروفیسر بیگ احساس نے محترمہ جیلانی بانو پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر مجید بیدار نے ''پروفیسر محسن عثمانی: تحریروں کے آئینے میں'' کے عنوان پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ پروفیسر عثمانی اگرچہ عربی کے استاد ہیں لیکن اردو میں بھی ان کی گراں قدر خدمات رہیں۔ جناب محمد امتیاز الدین نے جناب مجتبیٰ حسین پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ آسان زبان اور انسانی زندگی سے جڑا ہوا موضوع ان کی تحریر کی انفرادیت ہے۔ اس موقع پر معزز مہمانوں کا یادگاری لوح پیش کی گئیں۔ تقریب میں شہر کی کئی علمی اور ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 25 مئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں قطر سے آئے ہوئے مہمان شاعر عزیز نبیل کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی جب کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ دیگر معزز مہمانوں میں وزارت انسانی فلاح و بہبود میں ڈائرکٹر حسیب احمد، شبلی نیشنل ڈگری کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل ڈاکٹر افتخار احمد اور اسسٹنٹ کمشنر آف پولس محمد علی شامل تھے۔ نشست کی نظامت کے فرائض آصف اعظمی نے انجام دیے جب کہ ڈاکٹر شاہد پرویز نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نشست سے قبل خطاب میں ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ اردو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ وہ ایک تہذیب بھی ہے۔ آج کل 1857 کا کافی ذکر ہورہا ہے، اردو نے پوری جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آج اردو کو لے کر جس تشویش کا اظہار کیا جاتا ہے وہ مناسب نہیں ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے صرف حکومت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ خود اپنے اندر بھی جھانکنا چاہیے کہ اردو والے اردو زبان اور تہذیب کے تحفظ اور فروغ کے لیے کیا کررہے ہیں۔ ڈاکٹر سید فاروق نے عزیز نبیل اور ان کی انجمن کے ذریعے کیے جارہے کاموں کی ستائش کی اور کہا کہ اردو شاعری میں ابھی بہت دم ہے، جو بھی سن لے دیوانہ ہوجاتا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

● نئی دہلی، 2 جون۔ ادبی و ثقافتی تنظیم ''ملاقات کے زیراہتمام'' انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی ملیالم شاعری کے مجموعے کے اردو ترجمے ''میراسفر'' کے اجرا کے موقع پر ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پاکستان کے معروف شاعر عبدالغفور جوش نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مرزا عارف بیگ نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر مدھیہ پردیش کے گورنر ڈاکٹر بلرام جاکھڑ، صدر جمہوریہ کے پریس سکریٹری ایم۔ ایس۔ خان، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی موجود تھے۔ اس موقع پر جن شعرا نے شرکت کی ان میں عبدالغفور جوش، وسیم بریلوی، اسمٰعیل سلطانپوری، معراج فیض آبادی، مظفر رزمی کیرانوی، ساغر خیامی، ڈاکٹر کلیم قیصر، شہزاد احمد شہزاد، حق کانپوری، ڈاکٹر نسیم نکہت، فرحت شہزاد، طاہر فراز، شکیل شغائی، دنیش رگھونشی ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 10 مئی۔ 1857 پہلی جنگ آزادی کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر سرسید فاؤنڈیشن کے زیراہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر انیکسی میں مورخ کے ایم۔ ایس۔ خان کی نئی کتاب ''ایلیسی کویشن آف ٹرتھ'' اور پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیز الدین حسین کی کتاب ''1857 ری ریزینڈ'' کا اجرا راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے۔ رحمٰن خان کے ہاتھوں کیا گیا۔ پروگرام میں اے۔ آر۔ شیروانی، ایس۔ فاروق، ایران کلچر ہاؤس کے ایم۔ ایچ مظفری، صدیق الرحمٰن قدوائی، محمد ناظم، ڈی۔ پی۔ ایس۔ تور، کمال فاروقی وغیرہ سمیت متعدد شخصیات موجود تھیں۔ کتابوں کا اجرا کرتے ہوئے کے رحمٰن خان نے کہا کہ آج ہم آزادی کی جس کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں وہ ہزاروں، لاکھوں مجاہدین آزادی کی قربانیوں کا ہی نتیجہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مورخوں نے تاریخ کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ دونوں ہی کتابیں 1857 کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لائیں گی اور ان مجاہدین آزادی کو بھی سامنے لائیں گی جو تاریخ کی گرد میں کہیں کھو گئے تھے۔ کے ایم۔ ایس۔ خان نے اپنی کتاب ''ایکسکویشن آف ٹرتھ'' کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میری یہ دلی خواہش

تھی کہ ہمارے جن بزرگوں نے آزادی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور جنھیں فراموش کر دیا گیا، ان کے نام بھی منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا جو اثاثہ آرکائیوز وغیرہ کے گرد و غبار میں دفن ہے، اسے منظر عام پر لایا جائے۔ پروفیسر عزیز الدین حسین نے اپنی کتاب کے بارے میں بتایا کہ سر سید 1857 کی جنگ آزادی کے گواہ تھے 1857 کی جنگ آزادی پر انھوں نے جو دستاویز جمع کیے تھے انھی دستاویزوں میں سے 1857 کی 150ویں سالگرہ کے موقع پر 150 دستاویزوں کو بنیاد بنا کر یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے۔

اس موقع پر پروفیسر خواجہ شاہد نے کہا کہ جنگ آزادی کے مجاہدین کے بارے میں ہمارے لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری نئی نسل دھیرے دھیرے ان سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اس طرح کی تقاریب ہوتی رہنی چاہیے تاکہ آزادی کے مجاہدین اور سورماؤں کے بارے میں ہماری نئی نسل کو معلومات حاصل ہو سکیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● میسور۔ ہندوستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، میسور کی جانب سے منعقدہ نیولنگوسٹک سروے آف انڈیا کے کنونشن کے موقع پر 4 جون بوقت ساڑھے پانچ بجے شام کانفرنس ہال میں ادبی انجمن سنگم کی جانب سے غضنفر کے ساتویں ناول ''مم'' کا اجرا پروفیسر ادے نرائن سنگھ ڈائرکٹر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ زبیر شاداب نے ''مم'' کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ '' یہ ناول انسان کی تلاش و کاوش کا ایسا تحریری نگار خانہ ہے جہاں شری رام چندر، گوتم بدھ، خواجہ خضر اور اجنتا ایلورا کے حوالوں سے ہزاروں راہیں روشن ہوتی نظر آتی ہیں، مگر ان متوازی راستوں کا سفر بھی انسانی پیاس کو بجھانے میں ناکام نظر آتا ہے۔ ''مم'' یعنی پانی نہ صرف یہ کہ بچے کے منہ سے نکلنے والی پہلی علامتی آواز ہے بلکہ یہ زندہ رہنے کا پہلا استعارہ بھی ہے۔''

ڈاکٹر نہال احمد نے غضنفر کی کہانیوں پر تفصیلی مقالہ پیش کیا اور کہا کہ ان کی کہانیوں میں زندگی کے بیشتر حقائق کو اجاگر کرتے ہوئے عصری معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر غضنفر نے اپنا ایک افسانہ بھی ''سنگ مین'' سنایا جسے سامعین نے کافی پسند کیا۔ افسانوی نشست میں پروفیسر محمد زماں آزردہ نے بھی ایک افسانچہ سنایا۔

تقریب کے آخر میں شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر ادے نرائن سنگھ، پروفیسر زماں آزردہ، ڈاکٹر غضنفر، رزّاق افسر، سید راجل احمد، ڈاکٹر جوگ راج، گوہر تریکسروی، عارف میسوری ڈاکٹر غلام محی الدین سالک، برجیش کمار، ڈاکٹر زبیر شاداب اور ڈاکٹر آنند روی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

پروفیسر راجیش سچدیوا اور پروفیسر یون سبھہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 26 مئی۔ تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد کی وہ علامت تھی، جس نے برطانوی حکومت میں کھلبلی مچا دی تھی۔ ڈاکٹر منور حسن کمال کی کتاب ''تحریک خلافت اور جد و جہد آزادی'' کے اجرا کے موقع پر مقررین نے اس خیال کا اظہار کیا۔

ادبی، تعلیمی اور سماجی تنظیم ''خدمت'' کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب میں ڈاکٹر علی جاوید ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مذکورہ کتاب کا اجرا کیا۔ تقریب کی صدارت مرزا شاہد بیگ چنگیزی اور نظامت شکیل حسن شمسی نے کی۔ کتاب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مفتی محمد اکرم احمد نے کہا کہ جب تک کسی تحریک کو مذہب کا سہارا نہ ملے وہ تحریک نہیں بنتی۔ انھوں نے کہا کہ تحریک خلافت نے ملک کی تحریک آزادی کو ایسی سمت عطا کی جس کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوا۔ مفتی مکرم نے کہا کہ اس طرح کی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک خاص طور سے نئی نسل تک پہنچانا ضروری ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ تحریک خلافت کا بنیادی مقصد ہندو مسلم اتحاد تو تھا ہی، ساتھ ہی تیسری دنیا کے ممالک کو ظلم و استحصال سے بھی نجات دلانا تھا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس تحریک کی حمایت کرنے کے سبب گاندھی جی کی مخالفت کرتے ہیں لیکن گاندھی جی کا کہنا تھا کہ اس تحریک کی وجہ سے ملک کی آزادی کی تحریک کو ایک نئی راہ حاصل ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ تحریکیں اپنے مقصد سے پہچانی جاتی ہیں نہ کہ ناکامی اور کامیابی کی وجہ سے۔ بی. ڈی. چندن نے کہا کہ تحریک خلافت تحریک آزادی کا ایک اہم باب ہے اور اس تحریک سے جہاں ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوا وہیں اس سے ملک کی آزادی کی تحریک کو ایک نئی سمت ملی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 14 مئی۔ اردو ادارہ دہلی کے زیر اہتمام شہباز ندیم ضیائی کے چھٹے شعری مجموعے کا اجرا آج یہاں غالب اکادمی میں ماہنامہ ''کتاب نما'' کے مدیر ہمایوں ظفر زیدی نے کیا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید محمد فاروق نے کی جبکہ نظامت کے فرائض عمیر منظر نے انجام دیے۔ گلزار دہلوی نے شہباز ندیم ضیائی کی دستار بندی کی۔ اظہار خیال کرتے ہوئے سید راشد حامدی نے شہباز ندیم ضیائی کو دبستان داغ کی نمائندہ اور معتبر آواز قرار دیا۔ فصیح اکمل قادری نے کہا کہ شہباز ہماری ادبی اور شعری کائنات میں اسلاف کی روایتوں کے امین ہی نہیں مبلغ بھی ہیں۔ عمیر منظر نے کہا کہ شہباز کی شاعری فن کے سلیقے سے عبارت ہے۔ گلزار دہلوی اور شاد فدائی نے اس موقع پر منظوم خراج تحسین پیش کیا۔ اس موقع پر مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت معین شاداب نے کی۔ جن شعرا نے شرکت کی ان میں فصیح اکمل، معین شاداب، قمر

سنبھلی، پی پی اے، شمس رمزی، وارث وارثی، نگار عظیم، انور باری، صالحین فہمی، رؤف رامش، سید راشد حامدی، غالب رامپوری، شاد فدائی، مرزا محمد عارف، دکشت دنکوری اور اعجاز انصاری شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 11 جون۔ سویرا تنظیم کے زیر اہتمام آج غالب اکادمی حضرت نظام الدین میں معروف شاعر اعجاز انصاری کے شعری مجموعے ''تنہا نہیں ہوں میں'' کے اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر ایک کل ہند مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ عام طور پر کسی بڑی ادبی، سماجی یا سیاسی شخصیت کے ہاتھوں اجرا کرانے کی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اعجاز انصاری نے اپنے مجموعے کا اجرا اپنے والد محمد اسحٰق کے دست مبارک سے کرا کے سعادت مند بیٹا ہونے کا ثبوت دیا۔ تقریب کی صدارت شاعر مظفر حنفی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری اور ممبر اسمبلی پرویز ہاشمی نے شرکت کی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر معین شاداب نے ادا کیے۔ اپنی مختصر تقریر میں پرویز ہاشمی نے سب سے پہلے اعجاز انصاری کے والد محمد اسحٰق کو مبارکباد دی اور کہا کہ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی ہے کہ بیٹے کی کتاب کا اجرا کرنے کا موقع باپ کو حاصل ہو۔ اعجاز انصاری نے ایسا کر کے واقعی ایک سعادت مند بیٹا ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اعجاز انصاری کی اردو کے لیے خدمات سے سب واقف ہیں۔ انھوں نے سخت محنت کی ہے۔ آج ان کا اپنا ایک مقام اور نام ہے۔ معین شاداب نے اعجاز انصاری کا خاکہ پیش کیا جسے پوری دلچسپی کے ساتھ سنا گیا۔

اس موقع پر سویرا تنظیم کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر جاوید عالم، صنعت کار حبیب احمد، معروف شاعر متین امروہوی، سماجی کارکن امر سنگھ چودھری اور ایم. اے. ایف. اکادمی کو سویرا ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بعد ازاں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے معروف شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی صدارت مخمور سعیدی نے کی۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 21 مئی۔ بین مذہبی اور بین مسلکی اتحاد پر مبنی، فکر اسلامی کی نئی تشکیل، سیریز کا پہلا شمارہ کل ایک تقریب میں جاری کیا گیا۔ اس موقع پر اس کتاب کے مدیر مسئول اور مولانا کبیر الدین فوزان نے فکر اسلامی کی نئی تشکیل کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے بین مذہب اور بین مسلکی اتحاد پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرز فکر کے بارے میں موجودہ حالات میں مثبت رخ اپنانا چاہیے اور یہ رسالہ اسی سمت میں ایک قدم ہے۔ مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے رسالے کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اب پرانے رویے میں تبدیلی لانی چاہیے اور نئے طرز پر اسلامی مسائل پر بحث کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ کی فکری روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے جنھوں نے ''حجۃ البالغۃ'' میں شریعت کے اسرار و حکم پیش کیے ہیں اور تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ موجود حالات میں اسلام کی عقلی تعبیر بھی ضروری ہے مگر صرف عقل پر انحصار درست نہیں۔ ای ٹی وی اردو سے وابستہ اور کالم نگار آصف انور نے کہا کہ پورنیہ جیسے پسماندہ علاقے سے اس طرح کا بڑا کام قابل ستائش ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح کے رسالے کی بڑی شدید ضرورت تھی جس سے قومی و بین الاقوامی مسائل سمجھنے میں مدد ملے۔ عبدالقادر شمس قاسمی نے کہا کہ رسالے تو بہت نکلتے ہیں مگر یہ رسالہ انقلابی فکر کا ترجمان ہے اور کبیر الدین فوزان کا ذہن تقلیدی نہیں بلکہ اختراعی ہے۔ اس موقع پر معروف افسانہ نگار رفیع حیدر انجم، شاعر ضیاء علوی، محبوب علی، مولانا شعیب قاسمی، مولانا افتخار، حسیب صدیقی ایڈووکیٹ اور احسن مہتاب وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● یکم جون کی شام جناب پی. ایس. عبدالباری مدیر ماہنامہ ''نشانِ غزل'' کی صدارت میں ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں جناب محمد یعقوب اسکہ کی لکھی ہوئی دو خوبصورت کتابوں ''اردو سیکھیے برائے ایل. کے. جی.'' اور ''اردو سیکھیے برائے یو. کے. جی.'' کی رونمائی ڈاکٹر نثار احمد صاحب صدر شعبۂ عربی فارسی اور اردو مدارس یونیورسٹی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان سیکھنے کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہ کتابیں اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتابیں ہیں جن میں بچوں کے لیے آسان نرسری نظمیں لکھیں جن کہانیاں اور چھوٹی چھوٹی دعائیں شامل ہیں یہ رنگین خوبصورت اور باتصویر کتابیں بچوں کی دلچسپی کا باعث ہی نہیں ان کی تعلیمی ترقی میں معاون و مددگار بھی ثابت ہوں گی۔

(ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

سید ولی جعفری

● نئی دہلی۔ ڈاکٹر حافظ سید ولی حسین جعفری، استاذ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، ہمدرد یونیورسٹی، دہلی، کا اچانک اپنے وطن سلون (ضلع رائے بریلی) میں 25 مئی کو بعد نماز جمعہ انتقال ہوگیا۔ وہ باون سال کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

تعلیم سلون، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، لکھنؤ یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم

یونیورسٹی میں ہوئی جہاں سے انھوں نے ''الماوردی اور نظام الملک طوسی کے سیاسی افکار کا تقابلی مطالعہ'' کے موضوع پر پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری حاصل کی۔ ہمدرد یونیورسٹی کے قیام سے پہلے ڈاکٹر سید ولی حسین انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں سینئر فیلو تھے۔ بعد میں وہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں استاد مقرر ہوئے۔ مولانا شاہ احمد حسین، موجودہ سجادہ نشیں، خانقاہ کریمیہ سلون، نے 1983 میں ولی حسین صاحب کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

پروفیسر محمد منیر الدین تاجی

● دربھنگہ کی علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر محمد منیر الدین تاجی دو ماہ کی علالت کے بعد 28 مئی 2007 کو بعد اذان مغرب اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ 8 ستمبر 1934 کو پیدا ہوئے تھے۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر 72 سال تھی۔ آپ کے جنازے میں مختلف شہروں سے احباب اور عقید تمندوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ نئی بستی بدیرہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد منیر الدین تاجی نے اپنی عملی زندگی ایک تاجر کی حیثیت سے شروع کی تھی، لیکن تجارت میں خسارے کے بعد اسوسی ایشن اردو ہائی اسکول، بدیرہ میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ نے یہاں سات سال خدمات انجام دیں۔ ملازمت کے دوران ہی آپ نے فارسی میں ایم اے کیا اور 1971 میں جی. ایس. کالج کھامگاؤں میں لکچرر کی حیثیت سے منتخب ہو گئے۔ بعدازاں آپ نے اردو میں بھی ایم اے کرلیا۔ 1982 میں آپ نے ''فارسی شاعری میں تصوف'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ڈاکٹر تاجی، امراوتی یونیورسٹی میں فارسی بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین رہے۔ آپ فارسی کی نصابی کتب کے لیے مہاراشٹر بورڈ پونہ کے ممبر بھی رہے۔ نیز آپ ناگپور یونیورسٹی میں بھی مختلف خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ 1994 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ ملازمت کے علاوہ آپ سماجی خدمات بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ صابر ایجوکیشن سوسائٹی امراوتی کے چودہ سال صدر رہے۔ امراوتی ڈسٹرکٹ بار کی ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی رہے۔ آپ تادم مرگ جامع مسجد ٹرسٹ، نئی بستی بدیرہ کے سکریٹری رہے۔ آپ کے زیر نگرانی مسجد اور مدرسے کی عمارات کی تعمیر نو ہوئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چار فرزند اور تین بیٹیاں ہیں۔ آپ کے بڑے فرزند ڈاکٹر انجم ضیاء الدین تاجی، جی. ایس. کالج کھامگاؤں میں فارسی کے لکچرر ہیں۔ دوسرے فرزند اشفاق سیف الدین تاجی، قلندریہ اردو جونیئر کالج منگرول پیر میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ تیسرے فرزند محمد ذکی الدین تاجی اسوسی ایشن اردو جونیئر کالج امراوتی میں پالیٹیکل سائنس کے لکچرر ہیں۔ چوتھے فرزند بہزاد صفی الدین تاجی بی ایس سی ایل ایل بی ہیں اور امراوتی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ آپ کے دامادوں میں دو لکچرر اور ایک ہائی اسکول ٹیچر ہیں۔ (ڈاک سے)

مجاز نوری

● دربھنگہ۔ 30 مئی، مشہور و معروف صحافی اور بزرگ شاعر مجاز نوری کا طویل علالت کے بعد 27 اپریل 2007 کو دربھنگہ میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 80 سال تھی۔ ان کا اصلی نام انوار احمد نوری تھا وہ 17 نومبر 1930 کو اپنے ننیہال شکری پنڈول (مدھوبنی) بہار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبدالوہاب پیشکار بر ہولیا در بھنگہ کے متمول لوگوں میں شمال کیے جاتے تھے۔ مجاز نوری شاعری میں مہر شکروی کے شاگرد تھے۔

مجاز نوری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز 1953 میں رسالہ ''افق'' (دربھنگہ) کے مدیر معاون کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ 1940 کے آس پاس سہ ماہی ''رفتار نو'' (دربھنگہ) کے بانی و ایڈیٹر بھی رہے۔ 1985 میں ''تحفۂ ادب'' اور پھر 1999 میں ''ادب'' (دربھنگہ) کے نام سے رسالہ بھی جاری کیا۔ ان کے کئی تنقیدی کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ مجاز نوری کا شعری مجموعہ ''مرکز نگاہ'' بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے 2004 میں شائع ہوا۔ مجاز نوری کی ادبی خدمات کے اعتراف میں بر ہولیا، دربھنگہ کی ادبی و ثقافتی تنظیم کی طرف سے ''نوری اردو مرکز'' کے نام سے 1995 میں ایک ادارہ بھی قائم کیا گیا۔ موصوف ایک مدت تک ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی اردو (ہند) کی سرگرمیوں سے بھی وابستہ رہے۔ نوری اردو مرکز بر ہولیا، دربھنگہ کی جانب سے متعدد ادبا و شعرا نے مجاز نوری کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا اور ان کی ادبی و صحافتی خدمات کا اعتراف کیا۔ (ڈاک سے)

شاعرہ پروین جاوید

● کراچی۔ 14 مئی، اردو کی ممتاز شاعرہ پروین جاوید کا طویل علالت کے بعد یہاں ہفتے کے روز انتقال ہو گیا۔ وہ 54 برس کی تھیں۔ تدفین عزیز آباد میں عمل میں آئی۔ مرحومہ معروف اردو ادیب اور نقاد سرور جاوید کی اہلیہ تھیں۔ یہ اطلاع پاکستانی ادیب سہیل احمد صدیقی نے دی ہے۔ مسز صدیقی کے مطابق مرحومہ نے اپریل 2007 کو زندگی کے آخری مشاعرے میں شرکت کی تھی جو ہائیکو مشاعرہ تھا۔ پروین جاوید کا ہائیکو مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

□□□

تبصرہ وتعارف

● آئینۂ جہاں (جلد دوم)
مصنف: قرۃ العین حیدر
مرتب: ڈاکٹر جمیل اختر
صفحات: 612، قیمت: -/230 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: جاوید رحمانی، 401/2-AB، بدھ وہار، نئی دہلی-110087

قرۃ العین حیدر اردو فکشن کا سب سے معتبر نام ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی مرحوم تو انھیں ایشیا کی سب سے بڑی فکشن رائٹر کہا کرتے تھے۔ ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے۔

''ان کی کہانیاں، خواہ وہ افسانوں میں بیان کی گئی ہوں، ناولٹ میں یا ناولوں میں درحقیقت ہماری تہذیبی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔''

تاریخ کا یہ شعور قرۃ العین حیدر سے مخصوص ہے جو ان کی کہانیوں کو ہماری تہذیبی تاریخ کا حصہ بنا دیتا ہے۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز 1945 سے ہوا جب ان کا پہلا افسانہ ''ساقی'' میں شائع ہوا۔ انھوں نے دسمبر 1959 میں ''آگ کا دریا'' شائع کیا جو اردو کا سب سے بڑا اور متنازعہ فیہ ناول رہا ہے۔ قرۃ العین حیدر ادب اور تاریخ کا جتنا گہرا اور رچا ہوا شعور رکھتی ہیں اور ان کی کہانیاں ادب و تاریخ کا جتنا حسین امتزاج پیش کرتی ہیں اس کی دوسری کوئی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ یوں ان کے بڑے ہونے میں کسی کو شبہہ نہیں لیکن اردو میں ابھی تک فکشن کی تنقید کے tools ہی develop نہیں ہو سکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ابھی اس میں وقت لگے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح شاعری کی تنقید نے اپنا سفر طے کیا ہے فکشن کی تنقید بھی اسی طرح اپنا سفر طے کرے گی۔ ابھی تو ہمارا فکشن کا سرمایہ ہی اتنا وافر اور بوقلموں نہیں جتنا ہماری شاعری کا جمع ہو چکا تھا اور جس کی مدد سے شاعری کی تنقید نے ان جہانوں کی سیر کی۔ ابھی قرۃ العین حیدر کے فن سے ابھی پوری طرح انصاف نہیں کیا جا سکا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا کلیات قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لیے ڈاکٹر جمیل اختر نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ان کا ایک مضمون بھی ہے جس میں زبان کی غلطیوں کے علاوہ املا کی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں مثلاً ہر جگہ 'تو جیہ' کو ہائے ھطی سے یعنی 'توجیہ' لکھا ہے اور 'دگر گوں' کو 'دیگر گوں'۔

اس کتاب کا پیش لفظ قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے جو 25 صفحات کو محیط ہے۔ یہ انتہائی عالمانہ اور فکر انگیز ہے اور تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ہمارے رویے پر از سر نو غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''ضلع ہجنور میں عیسائیوں کا ایک بہت بڑا مستقر تاج پور کہلاتا ہے۔ یہاں کے کنور سیام سنگھ وغیرہ کا تذکرہ میں پہلے کر چکی ہوں۔ جو 1857 میں راقم الحروف کے اجداد کے خلاف انگریزوں کے حلیف کے طور پر لڑے تھے اور بطور سزا ہمارے پر دادا میر احمد علی کو پھانسی کی سزا کا حکم دیا گیا تھا اور دوسرے صاحبان کو راجا کا خطاب مع جاگیر عطا کیا گیا۔ یہ ڈراما ہندوستان میں جگہ جگہ کھیلا گیا۔ ہر موقع پر مسلمان گھاٹے میں رہا۔ مارا گیا یا کالے پانی بھیجا گیا۔ لیکن تاریخ کی بوالعجبی یہ ہے کہ اسی مسلمان کو انگریز کا پرستار، وفادار اور حلیف سمجھا گیا۔ اس پر علی گڑھ تحریک نے جو ایک قطعی ناگزیر تحریک تھی من حیث القوم مسلمانوں کی نیا کو ڈوبنے سے بچایا۔ لہٰذا میں اس پیارے بوڑھے سرسید احمد خاں کو بے شک اس ڈگمگاتے ہوئے سفینے کا ناخدا مانتی ہوں۔''

ہندوستانی تاریخ کی بوالعجبی ہی تو ہے کہ شیو پرساد کو تو سیکولر کہا گیا اور سرسید کو فرقہ پرست اور علاحدگی پسند۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مرہٹوں اور جاٹوں کی مسلسل یورشوں نے مغل حکومت کو کمزور نہ کیا ہوتا تو انگریزی حکومت کے لیے راستہ ہموار نہ ہوتا۔ لیکن مرہٹوں اور جاٹوں کی حب الوطنی پر تو حرف نہ آیا اور بے چارے مسلمانوں سے بدلہ مغلوں کے مفروضہ جور وستم کا چکایا گیا۔ آزاد ہندوستان کی ایک مشہور فلم میں ایک گیت ہے جس کو حب الوطنی کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے تقریباً تمام قومی تہواروں میں وہ گیت سنا جاتا ہے۔ اس میں شیواجی کی شجاعت کی داد اس مصرعے سے دی گئی ہے:

مغلوں کی طاقت کو جس نے تلواروں پہ تولا تھا

اس قسم کی بے شمار مثالیں ہندوستانی تاریخ کی بوالعجبی کی دی جا سکتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے اس پیش لفظ میں بھی اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ تحریر تاریخ کی پیچیدہ منطق پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالتی ہے اور جس طرح قدم قدم پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے یہ قرۃ العین حیدر کے قلم سے ہی ممکن تھا۔ تاریخ کے جبر اور انسان کی بے دست و پائی کا احساس قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں بھی عام ہے اور وہ اس کشاکش کو انتہائی فن کارانہ چابک دستی سے برتنا جانتی ہیں۔ اسی لیے ابوالکلام قاسمی نے لکھا ہے:

''ان کے ناولوں میں زمانی اور مکانی اعتبارات سے اس ماورائیت اور ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے جس کے فقدان کو عموماً ساری دنیا میں صنف فکشن کی

خامی کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔''

''آئینۂ جہاں'' جلد دوم میں 32 افسانے شامل ہیں جن میں 9 افسانے ایسے ہیں جو قرۃ العین حیدر کے کسی مجموعے میں شامل نہیں تھے۔ ان کی دریافت کا سہرا مرتب کے سر ہے۔ ''آئینۂ جہاں'' کی اس جلد میں فقیروں کی پہاڑی، نوٹو گرافر، روشنی کی رفتار، یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے اور آوارہ گرد جیسے افسانے موجود ہیں جو اردو افسانے کے تحت سے تحت انتخاب میں شامل کیے جا سکتے ہیں تو دوسری طرف دکھلا یئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار، اور 'میں بوری ڈوبت ڈری' جیسے ابتدائی افسانے بھی شامل ہیں جن کی روشنی میں قرۃ العین حیدر کے ذہنی ارتقا کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

● قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

مصنف: مرزا جعفر حسین

صفحات: 557، قیمت -/110 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: پرویز احمد اعظمی، شعبۂ سنسکرت، اسکول آف سوشل سائنسز، یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد-500046

لکھنوی تہذیب اپنے آپ میں ایک ایسی حسین و جمیل، پر کیف اور مسحور کن دنیا تھی جسے اپنی خصوصیت کی بنا پر عالم میں انتخاب تہذیب ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ تہذیب جو اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی یا یوں کہیں کہ اپنی مثال آپ تھی، بیسویں صدی کے نصف اول تک کسی نہ کسی شکل میں اپنے اندر اپنی ان جملہ خصوصیات کو سجوئے رکھی تھی جن کی بدولت اسے امتیازی شان کا وصف نصیب ہوا تھا۔ لیکن، زمانے کی شکست و ریخت کے سبب وہ امتیازی چیزیں مٹتی چلی گئیں اور لکھنؤ کا وہ تمدن جس پر ایک زمانہ نازاں اور فدا تھا انھی میں کہیں گم ہو کر رہ گئی۔ وہ لکھنؤ جس نے دنیا کو طرح طرح کی نئی چیزوں سے روشناس کیا جیسے کھانے کی چیزوں میں تنجن، ورقی بالائی، خاصگی، قورمہ اور کباب وغیرہ جیسے لذیذ کھانے، تفریح کے نئے نئے ڈھنگ نکالے، مثلاً: کبوتر بازی، پتنگ بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی جیسے کھیلوں کے میدان گرم کیے۔ محلوں کے اندر کام کرنے والی ماماؤں، اصیلوں، اناؤں اور باہر محل سرا میں رکاب داروں، مصاحبوں، منشیوں، سپاہیوں اور فراشوں کی سرپرستی کی۔ اسی طرح اس تہذیب نے بات چیت اور تخاطب کے نئے نئے انداز وضع کیے، مثال کے طور پر: السلام علیکم کی جگہ آداب، کورنش، بندگی اور تسلیمات عرض کرنے کا چلن رائج کیا..... زبان کو جلا دی اور صحتِ زبان کے سلسلے میں ایسا بے مثال کارنامہ انجام دیا کہ اردو زبان ہمیشہ اس کی مرہونِ منت رہے گی۔

زیرِ تبصرہ کتاب کا خالق اسی لکھنوی تہذیب کا پروردہ ہے۔ اسے اپنی تہذیب کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سے مکمل آگاہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی تہذیب کی خوبیوں کا ذکر نہایت خوبصورت اور دلکش پیرائے میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں اور زوال کے اسباب بھی بتائے ہیں۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا باب ''لکھنؤ کی آبادی اور متفرق حالات'' ہے۔ اس میں لکھنؤ کی آبادی کیسے اور کس طرح عمل میں آئی؟ سب سے پہلے کون آ کر آباد ہوا؟ کہاں آ کر قیام کیا؟ آج اس جگہ کا کیا نام ہے؟ اور کب آصف الدولہ نے فیض آباد کو ترک کر کے لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنایا؟ محلوں، گلیوں، سڑکوں اور منڈیوں کے نام کس طرح رکھے گئے اور اس کی کیا وجہیں تھیں؟ اس طرح کی تمام جزئیات کو بڑی خوبی اور تفصیل کے ساتھ فاضل مصنف نے بیان کیا ہے۔ مثلاً:

''شہر جب آباد ہوتے ہیں تو محلوں کا وجود میں آنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ کی بنیاد کب پڑی یا یہ کہ اس وقت کتنے اور کون کون سے محلے آباد ہوئے تھے...... وہ لکھنؤ جو ترقی کر کے علم و ادب اور مکارمِ اخلاق کا گہوارہ بنا اس کی بنیاد اکبر شاہ کے عہد میں پڑی تھی..... پرانے لکھنؤ کا قدیم چوک اپنی جگہ پر ایک ایسا ادارہ تھا جہاں لکھنؤ کا سارا کلچر سمٹ کر ایک نقطے پر ضوفگن ہو گیا تھا۔ کہنے کو ایک تپلی سڑک پر دو رویہ دکانیں اور بالا خانوں پر زنانِ بازاری رہا کرتی تھیں لیکن حقیقتِ امر یہ ہے کہ علم و ادب کے سوتے وہیں سے پھوٹتے تھے اور شعر و نغمہ کے چشمے اسی آبشار سے ابلتے تھے۔''

غرض یہ کہ اس باب میں محلے، سڑکیں، گلیاں، منڈیاں، بازاریں، چوک، عمارات و باغات، ذرائع نقل و حمل، اشیا کی قیمتیں اور ارزانی جیسے ذیلی عنوانات قائم کر کے تمام امور پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب ''رؤسا و امرا اور ان کی معاشرت'' ہے۔ اس باب میں رؤسا کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً: اس میں محل، محل سرائیں، ڈیوڑھیاں اور ان کے در و بست، وضع قطع، رہن سہن، خانگی زندگی، ملازمین و مقربین، دربار اور بیرونی معاشرت، دسترخوان اور وضع داریاں۔ ان ذیلی عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس باب میں کوئی ایسی چھوٹی سی چھوٹی بات نہیں ہے جس کا تعلق امرا سے ہو اور اس کا ذکر مصنف نے نہ کیا ہو؟ ''رئیسوں کے دسترخوان'' کے تحت ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''رؤسا کے یہاں سادے گوشت کے بجائے تیتر، بٹیر، ہریل، مرغ اور دیگر پرندوں کا ملا جلا ہوا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ بادام کی گری، بالائی اور زعفران کی شمولیت اس غذا کو بے حد لذیذ اور بہت معطر بنا دیتی تھی۔ یہ غذا لذیذ، لطیف، زود ہضم، مصلحِ معدہ و جگر، مولدِ خون صالح اور مقوی اعضائے رئیسہ سمجھی جاتی تھی۔''

اس باب میں کھانے کے جملہ پکوان پر جامع گفتگو کی ہے یعنی روٹی،

سالن، دال اور چاول کے ساتھ اگر میٹھے کھانے کو بھی شامل کرلیا جائے تو یہ کھانے کی پانچویں قسم ہوگی جن کی تمام اقسام کا احاطہ کیا گیا ہے۔ روٹی کے ذکر کے تحت اس وقت کی مروجہ روٹیوں کی سبھی قسموں کا ذکر ہے۔ اسی طرح سالن، دال اور چاول کی اقسام کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جس سے اس عہد کے پکوان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس قسم کا نفیس اور لذیذ کھانا لکھنؤ کے امرا روٴسا پسند کیا کرتے تھے۔

تیسرے باب کا عنوان ''شرفا اور ان کا طرزِ زندگی'' ہے، اس باب میں بھی پچھلے ابواب کی طرح: (1) وضع قطع اور طور طریقے (2) رہن سہن، طرزِ گفتگو اور میل ملت (3) لباس و طعام (4) ذریعۂ معاش اور (5) امرا و شرفا کی مشترک خصوصیات جیسے پانچ ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں۔ ان ابواب میں شرفا کی زندگی کے ایک ایک پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے ہمیں ان کی خانگی زندگی، گھر اور گھر کے باہر کے معمولات، اندازِ تخاطب، لہجہ، میل ملاپ، رہن سہن، لباس، طعام اور دیگر لوازمات، طور طریقے، امرا و دیگر شرفا کے روزمرہ اور شادی بیاہ و دیگر تقاریب کے کیا دستور تھے؟ ان سب کا ذکر کرتے ہوئے جعفر صاحب تحریر کرتے ہیں:

''اودھ کے حکمران عقیدتاً مسلمان اور نسلاً ایرانی تھے لیکن جس تہذیب و معاشرت کی انھوں نے تعمیر کی تھی وہ نہ عربی تھی اور نہ ایرانی۔ اس کو ہم خالص لکھنوی کلچر ہی سے تعبیر کرسکتے ہیں..... دوسرے صوبوں میں مسلمان السلام علیکم یا سلام علیکم کہہ کر ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ لکھنؤ میں خود اپنی زبان میں سلام کرنے کا چلن رائج ہوا اور اس سلام کے لیے متعدد الفاظ وضع کیے گئے۔ یعنی'' آداب''، ''تسلیم''، ''تسلیمات''، ''بندگی''، ''کورنش''، ''مجرا''، یہ الفاظ ''عرض ہے'' یا ''بجالاتا ہوں'' کے ساتھ مستعمل تھے۔''

سلام کے بعد مزاج پرسی بھی لکھنوی تہذیب میں شامل تھی۔ اس کے لیے مزاج شریف، مزاج مبارک، مزاج اقدس، مزاج عالی، مزاج مقدس، مزاجِ معلّیٰ اور مزاجِ گرامی جیسے القاب سے خیریت دریافت کرنا اہلِ لکھنؤ کا شیوہ تھا۔ ان کا استعمال حسب مراتب کیا جاتا تھا۔ مثلاً: بے تکلف دوستوں سے ''مزاج شریف'' یا ''مزاج مبارک'' کہہ کر خیریت دریافت کرتے تھے۔ رئیسوں سے ان کے درباروں میں ''مزاج مقدس'' یا ''مزاج گرامی'' یا ''مزاج عالی'' سے ان کی مزاج پرسی کی جاتی تھی اور علمائے کرام کے لیے ''مزاج عالی'' یا ''مزاج معلّیٰ'' کہنے کا چلن تھا۔ اس باب کے مطالعے سے لکھنؤ کا ماحول، میل جول، طرزِ تخاطب، محفل کے آداب، نشست و برخاست اور ہندو مسلم یگانگت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

''عوام و خواص کے تفریحی مشاغل'' اس کتاب کا چوتھا باب ہے۔ یعنی قدیم لکھنؤ میں تفریحِ طبع کے لیے کس کس طرح کے کھیل اور تماشے ہوتے تھے ان تمام تفریحی مشاغل کا احاطہ اس باب میں کیا گیا ہے۔ (1) بٹیر بازی (2) کبوتر بازی (3) مرغ بازی (4) پتنگ بازی اور (5) میلے اور دیگر تفریحی اجتماعات کے علاوہ دیگر تفریحی مشاغل میں ''کشتی لڑنے کا فن'' اور ''فنِ سپہ گری'' کا بھی ذکر موجود ہے۔ تلوار کی لڑائی کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی اور اسی کے تحت برچھا چلانا، تیراندازی اور بنوٹ وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں ان کا شمار ہنر میں کیا جاتا تھا ساتھ ہی ان کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے کافی ریاضت کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس باب میں ایک ذیلی عنوان ''سنیما اور تھیٹر'' بھی ہے، جس سے اس عہد میں سنیما کے چلن کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ روٴسا کے محلوں میں طرح طرح کی تقاریب، جلسے اور مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا تھا جو ان کے اثر و رسوخ اور ذوق کی مثال ہوا کرتے تھے۔

پانچواں باب ''طوائف بازی'' ہے، جس میں (1) زنانِ خانگی (2) زنانِ بازاری اور (3) ڈیرے دار طوائفیں، کے عنوان سے تین مزید ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ اس باب میں طوائفوں کی زندگی، ان کی حیثیت اور لکھنوی تہذیب کے فروغ میں ان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹا باب ''فنونِ لطیفہ'' ہے، جس میں (1) رقص و موسیقی، (2) مصوری و خطاطی اور (3) شناوری و غوطہ زنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتواں باب ''علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں'' ہے۔ اس باب میں (1) فرنگی محل (2) خاندانِ اجتہاد (3) سلطان المدارس (4) نوبستہ (5) جھوائی ٹولہ (6) اودھ پنچ اور (7) مطبع نول کیشور جیسے ذیلی عنوانات قائم کرکے تمام طرح کی ادبی اجتماعات کی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آٹھواں باب ''ادبی اور ثقافتی اجتماعات'' ہے۔ یہی وہ باب ہے جس میں لکھنؤ کے مشاعروں کا ذکر نہایت خوبی سے کیا گیا ہے اور اس کے لیے ایک ذیلی عنوان ''مشاعرے'' قائم کیا گیا ہے تاکہ اس کی تمام تر تفصیلات ولوازمات پیش کی جاسکیں۔ ساتھ ہی اس باب میں دو ذیلی عنوانات بھی ہیں: پہلا صوفیائے کرام کے مزارات اور دوسرا مجالسِ مرثیہ خوانی ہے۔ نواں باب ''قدیم عزاداری'' ہے۔ اس میں (1) محرم و چہلم (2) تعزیے شاہی اور عوامی (3) جلوس ہائے محرم و چہلم (4) مجالس و خواندگی اور (5) تقسیم تبرک جیسے ذیلی عنوانات ہیں۔ دسواں باب ''فن کاریاں اور صنعت کاریاں'' ہے، جس میں (1) چکن اور کامدانی (2) کارچوبی اور سلمے ستارے کا کام (3) طلائی اور نقرئی زیورات (4) پیتل اور تانبے کے ظروف (5) مٹی کے برتن اور کھلونے (6) دیگر ایجادات و اختراعات ذیلی عنوانات ہیں۔ گیارھواں باب ''محلوں میں زندگی'' ہے، جس میں (1) خانگی ماحول (2) انتظام خانہ داری (3) رہن سہن (4) بیگمات کا ذوق و شوق (5) ملازماؤں کا عملہ (6) زچہ خانہ (7) تربیت و تعلیم اطفال ذیلی ابواب ہیں۔ بارھواں باب ''شادی و غمی کی

تقاریب'' میں (1) خوشی کی رسمیں (2) شادی کی رسمیں (3) غمی کی رسمیں، تیرھویں باب ''پست طبقے کے عوام'' میں (1) رہن سہن (2) طرزِ زندگی (3) مالی حالت اور چودھویں باب ''انحطاط و زوال اور اس کے اسباب'' میں (1) مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی (2) سود و زیاں کی کش مکش میں جاگیرداری نظام نے دم توڑ دیا (3) تعیش بے تحاشا کا یہی انجام ہونا تھا'' جیسے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہیں۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب نہایت کارآمد ہے بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو قدیم لکھنؤ اور اس کی تہذیب سے لگاؤ رکھتے ہیں یا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

● سائنس کی کہانیاں (حصہ دوم)

مصنف: سکنف اور سکنف

صفحات: 183، قیمت: -/25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

مبصر: آغا محمد ظفر حسنین، 313، جہلم ہاسٹل، نئی دہلی۔ 110067

حیات و کائنات کی گتھیوں کو سلجھانے کی غرض سے انسان نے نئی نئی دریافت و ایجادات اور مختلف قسم کے تجربات کے ذریعہ ارتقا کے سفر کو ہمیشہ سے جاری و ساری رکھا ہے۔ آئندہ نسلوں کو انسانی تاریخ کے اس سفر سے روشناس کرانے کا کام جتنی آسانی سے کہانیوں کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے اتنا شاید کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔ اور جہاں تک بچوں کا سوال ہے تو اس حقیقت سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے کہ بچوں میں کہانیوں کے تئیں بڑا شوق پایا جاتا ہے۔ چونکہ معاشرے کے مزاج اور سوچ و فکر کو سائنسی بنانا ہمارے دستور کے بنیادی فرائض میں شامل ہے چنانچہ اس مقصد کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے بچوں کے لیے سائنسی کہانیوں کی کتابیں شائع کرنے کا جو سلسلہ قائم کیا ہے، زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سکنف اور سکنف کی انگریزی کتاب کا یہ اردو ترجمہ بنیادی طور پر علم طبعیات اور علم کیمیا کی مختلف دریافت و ایجادات سے متعلق کل 27 ابواب پر مشتمل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب کا پہلا باب تقریباً 250 سال قبل مسیح یونان میں کی گئی اس عظیم دریافت کے حوالے سے ہے کہ جس سے منسلک لفظ 'یوریکا' ہر نئی دریافت و ایجاد کا استعارہ بن گیا۔ یعنی اس باب میں آرشمیدس کے اصول کی اتفاقی دریافت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ 'نیوٹن اور سیب'، 'کچھ ابتدائی بھاپ کے انجن'، 'بادپیما کی دلربا کہانی'، 'ایکس ریز کے اتفاقی دریافت'، 'تابکاری کی دریافت' وغیرہ اس کتاب کے چند دیگر اہم ابواب ہیں۔ علم طبعیات اور علم کیمیا کے یہ وہ ابتدائی تجربات تھے جو سائنسی علوم کے ارتقا کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی بنیاد پر انسان نے آگے پیش آنے والی ترقی یافتہ منازل طے کیں۔

سائنس کے اس سفر میں بسا اوقات یہ مرحلہ بھی درپیش رہا کہ جب معاشرے میں موجود روایتی و مذہبی اقدار سائنسی انکشافات سے متصادم ہوتی نظر آئیں۔ اس کتاب کا آٹھواں باب ـــ اور درحقیقت زمین گردش کرتی ہے، اسی قسم کی ایک معرکہ آرائی کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہمارے نظام شمسی کے تعلق سے گیلیلیو کے اس انکشاف کے سبب کہ درحقیقت زمین سورج کے گرد طواف کرتی ہے نہ کہ سورج زمین کے گرد۔

سائنس کی دریافتوں اور ایجادات کی بدولت انسان کو جہاں ایک طرف گوناگوں سہولتیں میسر ہوئی ہیں وہیں دوسری طرف انھوں نے ہمیں بہت سے جان لیوا خطرات کے دہانے پر بھی لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ایٹم بم بنانے کے اصول کی ایجاد انھی میں سے ایک ہے جس کے غلط استعمال کے سبب ہیروشیما اور ناگاساکی جیسے دو جاپانی شہر تباہ و برباد ہوکر رہ گئے۔ دوسری جنگ عظیم سے متعلق اس پورے معاملہ کا لیکھا جوکھا کتاب کے 19ویں باب 'تاریخ کا سب سے بڑا سائنسی جوا' میں موجود ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ابتدائی قسم کے سائنسی تجربات کی کہانیاں بیان کرتی ہے بلکہ بچوں میں ضروری مثبت انسانی اقدار کی نشوونما بھی کرتی ہے۔ اس کتاب کا ایک خصوصی وصف یہ بھی ہے کہ اس کے ہر باب میں ایک دو تصویریں شامل کی گئیں ہیں تاکہ بچوں میں نہ صرف متعلقہ باب کے تئیں دلچسپی پیدا ہو بلکہ موضوع کو سمجھنے میں بھی مدد ملے۔ غرض بچوں میں سائنسی رجحان و میلان پیدا کرنے کے تعلق سے یہ ایک کارآمد کتاب ہے۔

● غالب تنقید

مصنف: جاوید رحمانی

صفحات: 168، قیمت: -/110 روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

مبصر: خواجہ اکرام ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جے این یو، نئی دہلی-110067

اگر ہمیں ان ادیبوں کی تلاش ہو جنھوں نے غالب پر تنقید کی ہو یا جن کی تحریریں غالب کی شاعری کی تفہیم میں معاون ثابت ہوں تو بڑی مایوسی ہوگی کیوں کہ یہاں پہنچ کر آپ ایک ایسی دنیا سے روبرو ہوں گے جہاں تشریح و تبصرہ اور خیالات کے انتشار تو ملیں گے مگر اکثر تحریریں رہنما اصولوں سے عاری نظر آئیں گی۔ جاوید رحمانی نے اس سمت میں جو کام کیا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ اس کتاب میں غالب کے نام پر جو بھی تنقیدیں صفحۂ قرطاس پر بکھری پڑی تھیں ان کا تجزیہ اور محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے کم از کم ان قارئین کو بڑا فائدہ ہوگا جو غالب کے حوالے سے کسی تنقیدی فکر کو سمجھنا چاہیں گے۔ اب تک غالب پر لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست رہی ہے۔ اس

کتاب میں جن اہم ناقدین کی تنقیدی کاوشوں اور تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور جس طرح لیا گیا ہے وہ بہت ہی اہم ہے۔ جاوید رحمانی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ جو اس میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، اپنی آنے والی کتاب میں یا اس کے دوسرے اڈیشن میں انھیں ضرور شامل کریں گے۔

یہ کتاب، چار ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ ان میں محمد حسین آزاد سے شمس الرحمٰن فاروقی تک کی غالب تنقید کے کیف وکم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلا باب دو ذیلی ابواب پر مبنی ہے جس میں محمد حسین آزاد اور حالی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں ماہرین غالبیات کے اس عام مفروضے کو رد کیا گیا ہے کہ غالب تنقید کی خشت اول مولانا حالی نے رکھی اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کے پہلے سوانح نگار محمد حسین آزاد ہیں۔ پھر ان دونوں بزرگوں کی اولیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب تین ذیلی ابواب سے عبارت ہے اس میں عبدالرحمٰن بجنوری، عبداللطیف اور یگانہ چنگیزی کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں شیخ محمد اکرام، مولانا غلام رسول مہر اور شوکت سبزواری کے کاموں کا مطالعہ کیا گیا ہے اور چوتھے باب میں کلیم الدین احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے اور جس انداز سے بے لاگ تبصرہ کیا ہے، میں اس حوالے سے ان کی اس کاوش اور ہمت کی داد دیتا ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ تنقید او رتجزیے اور تبصرے کی یہ صالح روایت اور بھی مستحکم ہوگی۔ اس کتاب کے فلیپ پر پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''جاوید رحمانی اپنے ہم عمروں میں سب سے بہتر اردو لکھتے ہیں۔''

● **دکھنی کلام اور اسلامی تہذیبی تاریخ**

مصنف: پروفیسر ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی مرحوم

مرتبہ: خواجہ معین الدین عزمی

صفحات: 491، قیمت: -/236 روپے

ناشر: محبوب علی خان اخگر، 19-3-262/17/2، جہاں نما،

حیدرآباد-500053

مبصر: ڈاکٹر محمد علی اثر، شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

بیسویں صدی کی پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں ہندو پاک کی فضائیں جن اہل قلم کے تصنیفی اور تالیفی کارناموں سے گونج رہی تھیں ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی کا ہے۔ تاریخ اسلام، بالخصوص قرآنیات میں انھوں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ اسلام میں ان کی تصانیف ''تقویم عیسوی و ہجری'' اور ''مسلمانوں کی بحری سرگرمیاں'' مشہور ہیں۔ 1985 میں مرحوم کی وفات کے بعد ان کی اب تک چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے 2 قرآنیات پر ہیں، ''ضمائر القرآن'' اور ''الاشباہ و النظائر فی القرآن الکریم''۔ سلاطین و امرائے ہند کے سنین پیدائش و وفات ڈاکٹر خالدی مرحوم نے اپنی کتاب ''وفیات اعیان الہند'' میں جمع کیے جو ایک انتہائی مشکل اور تھکا دینے والا کام تھا۔ زیر نظر کتاب ''دکھنی کلام اور اسلامی تہذیبی تاریخ'' مرحوم کی وفات کے بعد شائع ہونے والی کتابوں کی ایک کڑی ہے۔ اسلامیات اور قرآنیات کے علاوہ مرحوم کو دکنی زبان وادب سے گہری دلچسپی تھی۔ زیر نظر کتاب مرحوم کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ان کی زندگی ہی میں چھپ چکے تھے۔ یہ مضامین ''برہان'' دہلی، ''نوائے ادب'' ممبئی ''سب رس'' حیدرآباد جیسے علمی و ادبی رسائل میں چھپے تھے۔ ہمارے ملک کے کتب خانوں کی حالت سب پر عیاں ہے۔ رسائل کی مکمل فائل شاذ و نادر ہی کسی ہندوستانی کتب خانے میں موجود ہے۔ مرحوم کی تحریروں کے مداحوں کی خواہش تھی کہ شائع شدہ مضامین ایک جلد میں اکٹھا ہو جائیں تاکہ مطالعے میں آسانی رہے۔ یہ کتاب اس خواہش کی تکمیل ہے۔ دکنی شعر و ادب کی تحقیق و تدقیق و ترتیب کے سلسلے میں ڈاکٹر خالدی مرحوم کا سب سے اہم کارنامہ چار سوا کانوے صفحات پر مشتمل یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مرتب کتاب خواجہ معین الدین عزمی کے ''عرض مرتب'' اور ''ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی'' کے عنوان سے دو مضامین شامل ہیں۔ جن میں انھوں نے متن کتاب اور صاحب کتاب کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

دوسرے حصے میں ''چند دکھنی مثنویاں۔ دکن کی اسلامی تہذیبی تاریخ کے ماخذ کی حیثیت سے'' کے عنوان سے، ''معجزۂ فاطمہ'' کے موضوع پر مجبی فاروقی اور مکین کی مثنویاں، امین گجراتی کا قصیدہ، سیلان کا خمس، طالب کی ''بازو فاختہ'' اور آخر میں فتاحی کی مثنوی ''خاص الفقہ'' شامل ہے۔ ان نظموں کو ڈاکٹر خالدی نے تاریخی ترتیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے عالمانہ مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے جو علی الترتیب گیارھویں صدی کے نصف آخر، بارھویں صدی کے آغاز و اختتام اور تیرھویں صدی کے ربع اوّل کی دکنی زبان کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ خاتون جنت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ سے متعلق ان نظموں میں زیادہ تر خیالی قصے کہانیوں کو محیرالعقول واقعات کی رنگ آمیزی کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ طالب کی مثنوی ''بازو فاختہ'' اور اسمٰعیل کی ''گلشرنامہ'' کے موضوعات بھی کسی حد تک مذکورہ منظومات سے ملتے جلتے ہیں۔ صرف فتاحی کی مثنوی ''خاص الفقہ'' کا موضوع فقہی مسائل کی تعلیم و تفہیم ہے۔ ان منظومات کے مطالعے سے ایک طرف دکنی زبان کے عہد بہ عہد ارتقا اور لسانی تغیر و تبدل پہ روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف دکنی تہذیب و تمدن اور اس دور کے رسوم و رواج اور طور طریقوں کی وہ تصویریں بھی نظر آتی ہیں جن سے سیاسی تاریخیں بڑی حد تک خالی ہیں، بقول ڈاکٹر خالدی:

''ان مثنویوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس واقعے کو نہ بھولیے کہ انفرادی طور پر پڑھنے یا تنہا مطالعہ کرنے کے لیے تصنیف نہیں ہوئی ہیں بلکہ محفلوں میں سنانے اور مجلسوں میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ صنعتی معاشرے کی پیداوار نہیں جس کے پاس شاید سب سے بڑی قلت وقت ہی کی ہوتی ہے۔ یہ اس معاشرے کی پیداوار ہیں جس کے یہاں تفریح کے لیے میدانی کھیل ہیں نہ متحرک تصویریں۔ یہاں برقی روشنی نہیں ہے کہ رات میں بھی کارخانے چلتے رہیں اور برسات میں بھی تیز رو گاڑیاں رواں دواں رہیں۔ ہندوستان و دکن میں مشاعروں کے رواج عام سے پہلے تقریباً تین سو سال تک مثنوی کی سماعت مہذب و شائستہ لوگوں کی تفریح و تربیت کا مرغوب ذریعہ رہی ہے۔''

کتاب کا تیسرا حصہ دبستان بیجاپور کے دور آخر کے قادرالکلام صوفی شاعر محمد حسینی معظم کی پانچ مثنویوں ''گفتار عشق و عقل''، ''گنج مخفی''، ''گلزار چشت''، ''ثمرۃ الاتقیاء'' اور ''رسالہ وجودیہ'' بارہ نظموں اور ایک قصیدے کے علاوہ اٹھانوے غزلوں کی تحقیقی ترتیب و تدوین پر مشتمل ہے۔ ان تمام مثنویوں، غزلوں اور دیگر نظموں کے متون کو ڈاکٹر خالدی مرحوم نے تمام دستیاب نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد نہایت حزم و احتیاط اور تدوین متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں اختلاف نسخ، تلفظ الفاظ، فٹ نوٹ، حوالے اور حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ تدوین متن کے دوران واحد نسخے کی صورت میں کوئی لفظ نہیں پڑھا جا سکا یا اس کی تصحیح ممکن نہ ہو سکی کہ تحقیقی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے ایسے مقامات کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔

اس کتاب کو ڈاکٹر خالدی مرحوم کے لائق داماد (خواجہ معین الدین عزمی صاحب نے سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ دکھنی نظم و نثر کو پڑھنا، سمجھنا اور املا کرنا ایک بڑا دشوار کام ہے۔ عزمی صاحب نے یہ کام بہ خوبی انجام دیا ہے۔ مشہور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جناب محبوب علی خان اظہر کو زیر نظر کتاب روانہ کرنے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

''میں ڈاکٹر خالدی صاحب مرحوم کو ماہر اسلامیات تو جانتا تھا لیکن یہ خبر نہ تھی کہ وہ دکنیات کے بھی اتنے بڑے ماہر ہیں۔ انھوں نے دکنی مثنویوں پر جو حاشیے اس کتاب میں لکھے ہیں میں نے ان سے بہتر حاشیے کہیں نہیں دیکھے۔ دکن کے پرانے شعرا کو صحیح پڑھنا بے حد مشکل کام ہے۔ مرحوم کے حاشیوں نے اسے آسان کر دیا۔''

دکنیات پر کام کرنے والے ابتدا ہی سے کم رہے ہیں، اب بھی خال خال نظر آتے ہیں۔ اور آثار و قرائن یہی بتاتے ہیں کہ آئندہ بھی چند ایک ہی رہیں گے۔ برصغیر ہندو پاک کے ذخیروں میں دکنیات کے مخطوطات معیاری محققین کے منتظر ہیں کہ ان کو پڑھا جائے تاکہ ایک تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اس دشوار کام کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب نے ایک نئے زاویے سے دیکھ کر آسان کر دیا ہے۔ یہ کتاب اردو اور دکھنی ادب کے اساتذہ اور طلبہ دونوں کے لیے مفید اور تاریخ دکن کو سمجھنے میں کارآمد ہے۔

□□□

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت -/114 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

نورالرحمٰن فاروقی (بچوں کا گوشہ)

کمپیوٹر ماموں

ننھے میاں نے کے. جی. پاس کرلیا۔ بہت سارے اے (A) کے ساتھ۔ اب وہ درجہ اول میں آ گئے تھے۔ بہت خوش تھے۔ کیوں نہ خوش ہوتے۔ نیا بستہ، نئی کتابیں، کاپیاں، ربر، پینسل، کٹر... نئی نئی یونی فارم، نیا درجہ، نیا کلاس روم، اور وہی سب پرانے دوست۔ اپنی نئی کتابوں کو دوستوں کو دکھانے اور ان کی نئی نئی کتابیں دیکھنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ کیا ہوا جو سب کے پاس ایک سی ہی کتابیں ہیں۔

پہلے دن فجر کی نماز کے بعد ہی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ امی نے تو سویاں بھی بنائی ہیں۔ ابا نے بھی اچھے اچھے کپڑے پہنے ہیں۔ ننھے میاں نے تو نئی یونیفارم پہنی ہے۔ نئے نئے جوتے کیسے چمک رہے ہیں۔ بستہ ذرا بھاری ضرور ہے، لیکن نیا تو ہے۔ وقت سے پہلے ہی سب لوگ اسکول چل دیے۔ آج پہلا دن ہے نا۔ ابا، امی دونوں ننھے میاں کو اسکول چھوڑنے گئے۔ اسکول کیا، درجے کے اندر تک ننھے میاں کے ساتھ گئے۔ ننھے میاں کے سب دوست نئی نئی یونیفارم میں نئے نئے بستوں کے ساتھ آئے ہیں۔ ننھے میاں اپنے دوستوں سے باتیں کرنے میں مشغول ہوگئے۔ ابا امی خاموشی سے واپس چلے گئے۔ ننھے میاں نے ان کو خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھے۔ ننھے میاں خوش تھے نا۔

کلاس شروع ہونے کا گھنٹہ بجا اور ان کی ٹیچر آنٹی درجے میں آ گئیں۔ نئی ٹیچر۔ یہ گمان تو ننھے میاں کے خواب میں بھی نہیں گزرا تھا۔ پچھلی ٹیچر تو بہت پیاری تھیں۔ کیا پتہ یہ کیسی ہوں۔ کہیں یہ مارتی نہ ہوں۔ پہلے والی تو ڈانٹتی تک نہ تھیں۔ کیا پتہ۔ انھوں نے بولنا شروع کیا۔ جانے کیا بول رہی تھیں۔ ننھے میاں کی سمجھ میں تب آیا جب دوسرے بچوں نے جواب دینا شروع کیا۔ سب اپنا اپنا نام بتا رہے تھے۔ اپنے ابا کا نام بتا رہے تھے۔ ننھے میاں کا بھی نمبر آیا۔ انھوں نے بھی اپنا نام بتایا 'ننھے'۔ اپنے ابا کا نام بتایا 'ابا'۔ سب ہنسنے لگے۔ ٹیچر بھی ہنسنے لگیں۔ سب کیوں ہنس رہے ہیں بھلا؟ ننھے میاں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے دوست نے ان کا اور ان کے ابا کا بھی نام بتا دیا۔ بات آگے بڑھ گئی۔ ٹیچر آنٹی کچھ بول رہی ہیں اب۔

''آپ سب کو گنتی آتی ہے؟''

''آتی ہے۔''

سب بچوں نے مل کر جواب دیا۔ ننھے میاں نے بھی جواب دیا۔ ٹیچر آگے بولیں۔

''اب آپ لوگ ان کو جوڑنا اور گھٹانا سیکھیں گے۔ آپ لوگوں کو الف ب یاد ہے؟''

''یاد ہے۔''

''اب آپ ان کو ملا کر الفاظ بنانا سیکھیں گے۔ اے بی سی کسے کہتے ہیں؟''

اب ننھے میاں کو سب سمجھ آنے لگا تھا۔ مگر پھر گڑبڑ ہو گئی۔ ٹیچر بولیں۔

''اور کمپیوٹر کس کس کو آتا ہے؟''

کیا؟ کیا بولا ٹیچر نے؟ کم..... پو.....ٹر..... یہ کیا ہوتا ہے بھلا؟ ننھے میاں کے ہوش پھر اڑ گئے۔ یہ دیکھ کر کچھ جان میں جان آئی کہ بہت کم بچوں نے ہاتھ اوپر کیے ہیں۔ مگر یہ ہے کیا بلا؟ ٹیچر کہہ رہی تھیں۔

''اس سال میں آپ کو کمپیوٹر کے بارے میں بھی بتاؤں گی۔ یہ کیا ہوتا ہے، کیسا ہوتا ہے، اور اس کے کیا کیا فائدے ہیں۔ پھر اگلے درجوں میں آپ ان پر کام کرنا بھی سیکھیں گے۔ آپ لوگوں میں سے کمپیوٹر کس کس نے دیکھا ہے؟''

پھر بہت کم ہاتھ اوپر ہوئے۔

''اچھا چلیے۔ آج میں آپ سب کو کمپیوٹر دکھاتی ہوں۔ اس کے بعد آپ لوگ چاہیں تو میدان میں جا کر کھیل سکتے ہیں۔ یا جو چاہیں درجہ میں بیٹھ کر ڈرائنگ بنا سکتے ہیں۔ پڑھائی ہم کل سے شروع کریں گے۔''

ٹیچر آنٹی چل دیں۔ سب بچے ساتھ ہو لیے۔ ننھے میاں بھی ساتھ ہو لیے۔ ننھے میاں بہت خوش ہیں۔ یہ ٹیچر تو بہت اچھی ہیں۔ بہت ہی اچھی ہیں۔ کے. جی. والی ٹیچر تو کبھی میدان کی طرف جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔ ننھے میاں اور ان کے دوست دالان میں کھڑے ہو کر بڑی حسرت کے ساتھ میدان میں کھیلتے بڑے بچوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ کے. جی. والی ٹیچر تو کبھی ان لوگوں کو درجہ سے باہر بھی نہیں لے گئیں۔ اچھی ٹیچر.....

ٹیچر سب بچوں کو لے کر اس طرف مڑ گئیں جدھر بہت سے بڑے بڑے کمرے تھے۔ اب تک ننھے میاں اور ان کے دوستوں کو ادھر جھانکنے تک کی اجازت نہ تھی۔ ننھے میاں اور ان کے دوستوں میں ان کمروں کے بارے میں بہت سی پر اسرار کہانیاں رائج تھیں۔ ان کہانیوں کو کہتے سنتے ہوئے کوئی نہ کوئی ان کہانیوں میں ایک نئی کہانی جوڑ دیتا تھا۔ جتنی خوفناک وہ کہانی ہوتی تھی، اتنی ہی ان کمروں میں جھانکنے کی خواہش ان لوگوں میں بڑھ جاتی تھی۔ اور آج ٹیچر آنٹی ان لوگوں کو ان ہی خوفناک اور پر اسرار کمروں میں لے جا رہی تھیں!

ٹیچر نے ایک بڑے سے کمرے کا بڑا سا دروازہ کھول کر سب بچوں کو اندر چلنے کو کہا۔ ننھے میاں نے کمرے کے باہر لگے بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کم (com)... پو(pu)...ٹر(ter)...لب (lab)....(کمپیوٹر لیب - Computer Lab)۔ ننھے میاں کو کچھ خاص سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سب بچوں کے ساتھ اندر ہو لیے۔ کمرے کے اندر ہر طرف چھوٹے چھوٹے ٹی. وی. رکھے ہوئے تھے۔ ہر ٹی. وی. کے ساتھ ایک بڑا سا ڈبہ رکھا تھا اور سامنے ایک پٹرے پر بہت سے بٹن بنے تھے جن پر اے، بی، سی... ایک عجیب سے انداز میں لکھا ہوا تھا۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا چیزیں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں اور عجیب عجیب بتیاں جل رہی تھیں۔ یہ پر اسرار کمرہ

کچھ زیادہ ہی پرسرار تھا۔ کمرے میں ہر طرف تار ہی تار بکھرے ہوئے تھے اور کمرے کی ہر چیز ایک دوسرے سے کسی نہ کسی تار سے جڑی ہوئی تھی۔ ننھے میاں گھبرا گئے۔ ان کی امی نے ہمیشہ ان کو تاروں سے دور رہنے کو کہا ہے۔ ان میں بجلی ہوتی ہے۔ اس سے کرنٹ لگ جاتا ہے۔ آدمی مر سکتا ہے۔ ننھے میاں ڈر کر سب سے پیچھے ہو گئے۔ ٹیچر نے ایک ٹی۔ وی۔ کے پاس رکھے ڈبے پر لگے ایک بٹن کو دبایا۔ ٹی۔ وی۔ پر طرح طرح کے عکس ابھرنے لگے۔ سب بچوں نے ٹیچر اور اس ٹی۔ وی۔ کو گھیر لیا۔ ننھے میاں چونکہ سب سے پیچھے تھے، ان کو ٹی۔ وی۔ نظر آنا بند ہو گیا۔ ٹیچر کچھ بتا رہی تھیں۔ ننھے میاں کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ٹی۔ وی۔ پر تصویریں بدل رہی تھیں۔ ننھے میاں کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نظریں گھما گھما کر کمرے میں رکھے دوسرے ٹی۔ وی۔ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب کے کالے کالے پردوں پر ان کو طرح طرح کے سائے ناچتے نظر آ رہے تھے۔ سب سائے ننھے میاں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ننھے میاں کا دل کر رہا تھا کہ زور زور سے رونا شروع کر دیں۔ مگر اتنے ڈراؤنے کمپیوٹروں کے سامنے ان کے منھ سے آواز بھی نہ نکلی۔ یہ تو رات والے کالے بھوت سے بھی زیادہ ڈراؤنے ہیں۔ رات والا کالا بھوت تو صرف رات میں آتا ہے اور اکیلا ہی آتا ہے۔ اور وہ تو ابا سے ڈرتا بھی ہے۔ مگر یہ تو اتنے سارے ہیں۔ اور دن میں بھی نظر آ رہے ہیں۔ اور ابا نے تو کبھی ان کا نام بھی نہیں لیا۔ کیا پتہ ابا بھی ان سے ڈرتے ہوں۔ کیا پتہ۔ یہ نئی ٹیچر کتنی خراب ہے۔ بہت بہت خراب ہے۔ گندی ٹیچر.....

ننھے میاں گھر آ گئے۔ اداس اداس۔ امی نے بلائیں لیں۔ بچہ تھک گیا ہے شاید، انھوں نے سوچا۔ زیادہ کچھ پوچھا نہیں۔ شام کو ابا نے بات کرنے کی کوشش کی۔ ننھے میاں نے بتایا:

''نئی ٹیچر بہت گندی ہے۔''

''اچھا'' ابا بولے۔ ''وہ نہاتی نہیں ہے کیا؟''

''ابا''، ننھے میاں ناراض ہو گئے۔ ابا نے منانے کی کوشش کی اور ننھے میاں کو گود میں لے لیا۔ آخر ننھے میاں بولے:

''ابا، آپ نے کمپیوٹر بھوت دیکھا ہے؟''

''کمپیوٹر بھوت''، ابا ہنس پڑے۔ ''یہ کیا ہوتا ہے بھلا؟''

اور ننھے میاں نے اسکول کا پورا واقعہ دہرا دیا۔ ابا ایک پل کو ہنسے، پھر خاموش ہو گئے۔ بولے:

''کمپیوٹر تو بہت کام کا ہوتا ہے بیٹا۔ وہ تو ہماری بہت مدد کرتا ہے۔ اور بھوت ووت تو کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ میں نے کتنی بار سمجھایا ہے آپ کو۔''

''لیکن اس کے ہاتھ پیر تو تھے نہیں۔'' ننھے میاں بولے، ''وہ کام کیسے کرتا ہے؟''

ابا بولے: ''اچھا، ابھی آپ کھیلیے۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ میں آپ کو رات میں سونے سے پہلے کمپیوٹر کے بارے میں بتاؤں گا۔''

اور ابا باہر چلے گئے۔ اپنے کسی دوست سے ملنے۔ انھیں خود بھی تو معلوم کرنا تھا کہ کمپیوٹر آخر کام کیسے کرتا ہے؟

ابا کافی دیر بعد واپس آئے، بالکل رات کے کھانے کے وقت پر۔ ان کے ہاتھ میں کچھ کتابیں بھی تھیں جن کے ورق وہ کھانے کے دوران بھی پلٹتے رہے۔ کھانے کے بعد ننھے میاں کا سونے کا وقت ہوتا ہے، اور ابا کا کہانیاں سنانے کا۔ آج تو ابا کو کمپیوٹر کی کہانی سنانی تھی۔ کمپیوٹر کا خیال آتے ہی ننھے میاں کے پھر ہوش غائب ہو گئے۔ انھیں پھر ہر طرف کمپیوٹر بھوت ناچتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ابا کچھ بتا رہے تھے، ننھے میاں کو سن کر بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ابا سمجھا رہے تھے، ننھے میاں کو سمجھ کر بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابا کتابوں میں تصویریں دکھا رہے تھے، ننھے میاں کو دیکھ کر بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابا سناتے چلے گئے۔ ننھے میاں سنتے چلے گئے۔ بھوت سارے ناچتے چلے گئے۔ ابا کتابوں میں کھو گئے۔ ننھے میاں لحاف میں دبک کر سو گئے۔ بھوت ہواؤں میں ہوا ہو گئے۔

اچانک ایک زور کی آواز ہوئی۔ جیسے کمرے میں کوئی کودا ہو۔ ننھے میاں نے جلدی سے ابا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ خالی بستر سے ٹکرا گیا۔ ابا وہاں نہیں تھے۔ ننھے میاں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے کمپیوٹر بھوت کھڑا تھا۔ ننھے میاں نے زور کی چیخ ماری۔ مگر چیخ ان کے گلے سے نکلی نہیں۔ اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا، بالکل برف کی طرح۔ آنکھیں باہر کو آ گئیں، ننھے میاں کو لگا وہ کانپ بھی رہے ہیں۔ بھوت ہنس پڑا۔

''سلام ننھے میاں۔''

ننھے میاں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ بس ذرا ہوش سنبھل گئے۔ کمپیوٹر بھوت کو انھوں نے ٹھیک سے دیکھا۔ یہ تو پورا آدمی تھا۔ سر کی جگہ پر ٹی.وی. تھا۔ ڈبے کا جسم۔ ہاتھوں میں وہ اے. بی. سی. والا تختہ تھا نا، وہ لے رکھا تھا۔ اس کے تو دم بھی تھی۔ اور تو اور۔ اس کی دم میں ایک چوہا لٹک رہا تھا۔ اور ننھے میاں ہنس پڑے۔ یہ کیسا بھوت ہے بھلا۔ اس کی تو دم میں چوہا لٹک رہا ہے۔ اور ننھے میاں زور سے ہنس پڑے:

''آپ کیسے بھوت ہیں؟ آپ کی دم میں تو چوہا لٹک رہا ہے۔''

''بھوت.... کیسا بھوت..... یہ بھوت کیا ہوتا ہے ننھے میاں؟'' کمپیوٹر بھوت نے پوچھا۔

''آپ۔ آپ بھوت ہیں۔ آپ بھوت نہیں ہیں کیا؟''

''بھوت؟ اچھا۔ ابھی دیکھتا ہوں۔''

بھوت کے ہاتھوں میں جو تختہ تھا اس نے اس پر کچھ بٹن دبائے۔ اور اس کے چہرے پر سے آنکھ، ناک، منھ ہٹ گئے اور ان کی جگہ تصویریں اور عبارتیں ابھرنے لگیں۔ پھر دوبارہ اس کا چہرہ واپس آ گیا اور وہ بولا:

''میں نے سب معلوم کر لیا۔ بھوت ووت کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صرف بچوں کے دماغ کا ایک خیال ہے۔''

''اگر بھوت نہیں ہوتا تو آپ کیا ہیں؟'' ننھے میاں نے پوچھا۔

''میں۔ میں تو کمپیوٹر ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے کمپیوٹر ماموں کہہ لیں۔ آپ کمپیوٹر کے بارے میں نہیں جانتے؟''

''نہیں، نہیں، جانتا کیوں نہیں ہوں،' ننھے میاں کیونکر کہہ دیتے کہ انھیں کچھ نہیں معلوم۔ ''ابا نے بتایا ہے۔ مگر میں ذرا بھول گیا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں گے اپنے بارے میں؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔'' کمپیوٹر بولا، ''سب بچوں کو میرے بارے میں معلوم ہونا چاہیئے۔ کمپیوٹر، اِنٹرنیٹ، ورلڈ وائڈ ویب وغیرہ تو آج کی زندگی کی ضرورت بن چکے ہیں۔ میں آپ کو سب کے بارے میں بتاؤں گا۔ آپ سنیں گے؟''

''ہاں ہاں۔ کیوں نہیں سنوں گا؟'' ننھے میاں فوراً بولے اور بستر پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کمپیوٹر نے بولنا شروع کیا۔

''کمپیوٹر، جس کو آپ جنتر منتر بھی کہہ سکتے ہیں، آج کی دنیا میں اسے سب جانتے ہیں۔ جو کمپیوٹر کو جانتا ہو وہ اِنٹرنیٹ اور آفاقی تانے بانے (World Wide Web) سے واقف نہ ہو، یہ بھی مشکل ہے۔ اِنٹرنیٹ کے ذریعہ کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود شخص سے تفصیل سے تبادلۂ خیال کرنا آدمی کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن گیا ہے۔ ہاں، اگر وہ موش (mouse) کو بائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے تو، ورنہ داہنے ہاتھ کا کھیل کہہ لو۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور اِنٹرنیٹ تک عام آدمی کی پہنچ آسان ہوگئی ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ ادارے اور زیادہ سے زیادہ لوگ آج روزمرّہ کی زندگی اور کام کاج میں کمپیوٹر کا استعمال کر رہے ہیں۔''

''موش۔ وہ جو آپ کی دم میں لٹکا ہوا ہے؟ اس کو ہاتھ سے پکڑنا پڑتا ہے؟ یہ کاٹتا نہیں؟'' ننھے میاں نے پوچھا۔

''ننھے میاں۔ آپ تو بہت ڈرتے ہیں۔ یہ تو بالکل کھلونا ہے۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات۔'' کمپیوٹر بولا۔

''جی نہیں۔ میں کیوں ڈروں گا؟ میں تو بھوت سے بھی نہیں ڈرتا۔ اور پتہ ہے میرے ابا تو شیر سے بھی نہیں ڈرتے۔'' ننھے میاں کہاں ہار ماننے والے تھے۔

''وہ سب تو میں نہیں جانتا۔'' کمپیوٹر بولا، ''مگر آپ کو موش سے ٹک ٹک کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔ یہ میں یقین سے جانتا ہوں۔ میرے پاس اور بھی مزے کی چیزیں ہیں۔ آپ نے جامِ جمشید یا جامِ جہاں نما کے بارے میں ضرور سنا ہوگا۔ ابا نے جامِ جمشید والا قصہ سنایا ہوگا۔ یہ سب قصوں اور کہانیوں کی باتیں جب تھیں تب تھیں۔ اب یہ چیزیں ہمارے سامنے کمپیوٹر کی آرسی (screen) پر تانا بانا ورق (web page) کی شکل میں موجود ہیں۔ دنیا بھر کا حال اس پر دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے؟ آج سے کچھ ہی سال پہلے تک چھوٹی سے چھوٹی معلومات حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں کسی لائبریری میں گزارنے پڑتے تھے۔ کبھی کبھی تو لائبریری در لائبریری بھٹکنا پڑتا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں کے اخبارات چھاننے پڑتے تھے۔ اب آپ کمپیوٹر کھولیے، اس کو انٹرنیٹ سے جوڑیے، کسی بھی اچھے حربۂ تلاش (search engine) کو حکم دیجیے کہ وہ دنیا بھر سے وہ تمام معلومات ڈھونڈ لائے جس

کی آپ کو ضرورت ہے۔ اور چند ہی لمحوں میں آپ کی ضرورت سے وابستہ ویب صفحات کی بارش شروع ہو جائے گی۔''

''آپ کے پاس الہ دین کا چراغ ہے کیا؟'' ننھے میاں نے ٹوکا۔

''الہ دین کا جن یاد آ گیا۔ ننھے میاں، جن اگر آج ہوتا تو مجھ کو ساتھ لے کر گھومتا۔ میں تو اس سے بھی بڑا جن ہوں۔''

''ارے باپ رے۔ تو پھر میں آپ کو حکم کیسے دوں گا؟''

''آسان ہے ننھے میاں،'' کمپیوٹر بولا۔ ''یہ جو میرے ہاتھ میں بساط دیکھ رہے ہیں نا۔ کلیدی بساط (key board)۔ بس اس کے ذریعے اپنا حکم داخل کر دیجیے۔ میں فوراً کام میں لگ جاؤں گا۔''

''واہ۔ آپ تو بڑے کام کے ہیں۔ پھر میں آپ سے ڈرتا کیوں ہوں؟'' ننھے میاں کے منہ سے نکل ہی گیا۔

''اچھا۔'' کمپیوٹر بولا۔ ''آپ اب بھی ڈرتے ہیں مجھ سے؟''

''نہیں نہیں۔'' ننھے میاں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فوراً تن کر بیٹھ گئے۔ ''میں تو آپ کی دم کھینچوں گا۔''

ننھے میاں بستر پر کھڑے ہو گئے۔ جیسے سچ مچ اس کی دم کھینچنے جا رہے ہوں۔ کمپیوٹر چلا پڑا۔

''نہیں... میری دم نہ کھینچنا۔ پھر سب مجھے دم کٹا کہیں گے۔''

اور وہ بھاگ کر کھڑکی سے باہر کود گیا۔ ننھے میاں اس کو پکارتے رہ گئے۔

''کمپیوٹر ماموں۔ مت جایئے۔ میں دم نہیں کھینچوں گا۔ میں صرف موش سے کھیلوں گا۔''

مگر کمپیوٹر تو اب ننھے میاں سے ڈر گیا تھا۔ وہ نہ ٹھہرا۔ البتہ یہ چیخ پکار سن کر ابا بھاگتے ہوئے آ گئے۔

''کیا ہوا ننھے میاں؟ کون تھا؟'' ابا نے پوچھا۔

''کمپیوٹر ماموں۔ وہ چلے گئے۔'' ننھے میاں رونہانسے ہو گئے۔

''کمپیوٹر ماموں؟'' ابا کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے خواب دیکھا ہوگا ننھے میاں۔''

''نہیں۔ خواب نہیں تھا۔'' ننھے میاں اڑ گئے۔ ''ابھی کمپیوٹر ماموں تھے یہاں۔''

''کون تھا؟ کیا خواب دیکھ لیا؟'' امی اندر آتی ہوئی بولیں، ''ننھے میاں، آپ جاگ گئے۔ چلیے اچھا ہوا۔ اسکول کی تیاری شروع کرتے ہیں۔''

اسکول کا نام سنتے ہی ننھے میاں پھر سے بستر میں گھس گئے۔ ''نہیں نہیں۔ میں تو ابھی سو رہا ہوں۔ ابھی تو ابا نے بتایا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔''

''اچھا۔'' امی بولیں۔ ''آپ تو کل بتا رہے تھے کہ آپ کے اسکول میں بہت سارے کمپیوٹر ہیں۔''

''ہیں۔ بالکل ہیں۔'' ننھے میاں پھر سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ ''بہت سارے۔ میں تو اسکول جا رہا ہوں۔ جلدی سے

تیار ہو جاتے ہیں۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

دوسرا دن۔ ابا اسکول کے پھاٹک تک آئے۔ ننھے میاں نے خوشی خوشی ان کو خدا حافظ کہا اور کلاس کی طرف چل دیے۔ گھنٹہ بجنے تک ننھے میاں اپنے سب دوستوں میں ہی نہیں بلکہ پورے درجے میں اپنی نئی معلومات کی دھاک قائم کر چکے تھے۔ جب ٹیچر نے پوچھا۔

''آج کیا پڑھیں گے آپ لوگ؟'' تو ننھے میاں نے فوراً ہاتھ کھڑا کر دیا اور زور سے بولے:

''کمپیوٹر۔''

''اچھا؟'' ٹیچر نے کہا۔ ''کل تو آپ سب سے پیچھے چل رہے تھے۔''

''وہ اس لیے نا ٹیچر کہ مجھے کمپیوٹر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے نا۔'' ننھے میاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''اچھا۔'' ٹیچر نے ذرا حیرت سے کہا۔ ''آپ کو کیا کیا معلوم ہے؟ ذرا یہاں آ کر سب کو بتائیں گے۔''

ننھے میاں تو جیسے اس لمحے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

''کمپیوٹر ماموں بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ ان کو دنیا کی ہر بات معلوم ہے۔ جب ہمیں ان سے کچھ پوچھنا ہوتا ہے تو ہم کلیدی بساط کے ذریعے لکھ کر ان کو حکم دے سکتے ہیں اور وہ اپنی آرسی پر فوراً جواب دکھا دیتے ہیں۔ اور ان کی دم میں ایک موش لٹکتا رہتا ہے جس سے ٹک ٹک کرنے میں بہت مزہ آتا ہے۔''

ننھے میاں سانس لینے کو بھی نہ رکے۔ اور ٹیچر کے منھ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

''ایں۔''

یہ سب تو ان کو بھی نہ معلوم تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ ننھے میاں کو دیکھتی رہیں، پھر ہنس پڑیں۔ انھوں نے ننھے میاں کو گود میں اٹھا لیا اور پورے درجے سے مخاطب ہوئیں۔

'ننھے میاں کو تو واقعی کمپیوٹر کے بارے میں بہت کچھ آتا ہے۔ اب کے جب ہم کمپیوٹر کی پڑھائی پڑھیں گے تو ننھے میاں ہی سب کو پڑھائیں گے۔'' وہ ننھے میاں سے مخاطب ہوئیں۔ ''کیوں ننھے میاں؟''

''جی ہاں ٹیچر۔'' ننھے میاں نے زور سے کہا۔ وہ بہت خوش تھے۔ ان کی ٹیچر نے سب کے سامنے ان کی تعریف کی تھی۔ ان کو گود میں لیا تھا۔ کتنی پیاری ہیں یہ ٹیچر۔ ننھے میاں دل میں سوچ رہے تھے۔ اچھی ٹیچر.....

پتہ:

43 - A, Pocket - A, Sukhdev Vihar, New Delhi - 110025, Bharat.

□□□

کانفرنس میں ریاست ہریانہ کے وزیر تعلیم جناب
پھول چند ملانا نے بھی شرکت فرمائی۔ قومی اردو کونسل کے
ڈائرکٹر ڈاکٹر علی جاوید نے شال اڑھا کر ان کا استقبال کیا۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل اور ہریانہ اردو اکادمی کی
نئی مطبوعات کی رونمائی بھی ہوئی۔ تصویر میں بائیں سے
کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین جناب ن م سعید،
ریاستی وزیر جناب اقبال انصاری، جناب
ٹی این چترویدی، جناب شمس الرحمن فاروقی اور
ڈاکٹر علی جاوید یہ رسم انجام دیتے ہوئے۔

ڈاکٹر علی جاوید کوئی اہم بات محترم گورنر صاحب کے
گوش گزار کرتے ہوئے۔

Date of Publication : 24/06/2007

URDU DUNIYA Monthly, July 2007, Vol. 9, Issue:7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

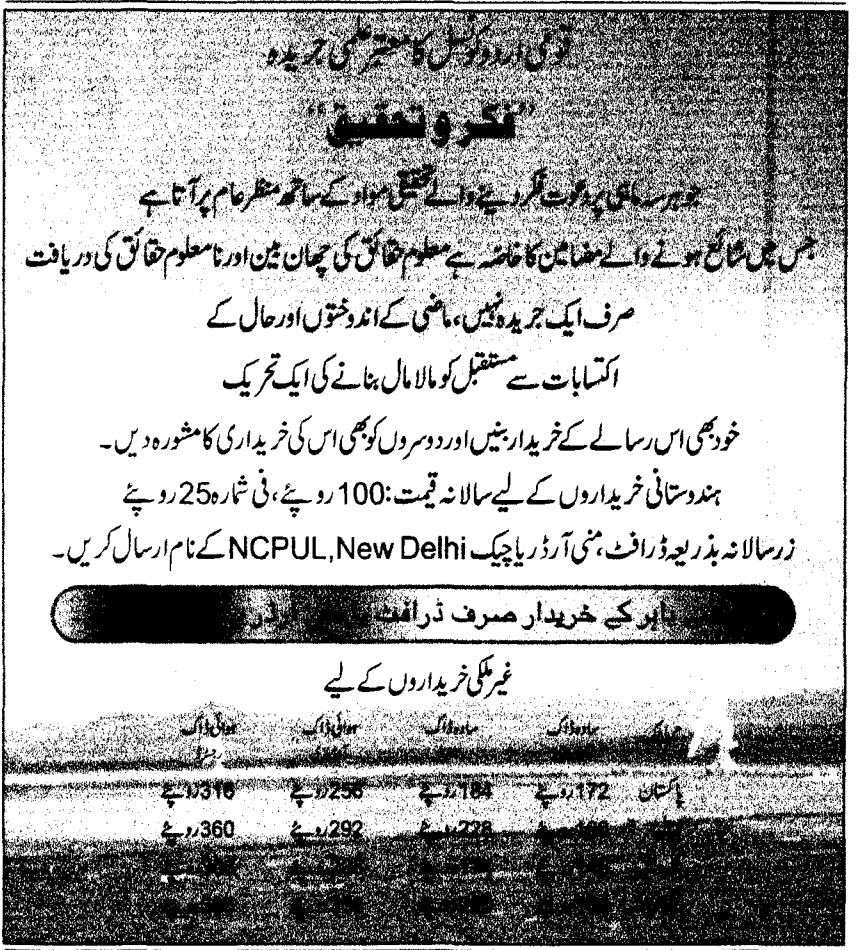

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Printed and Published by Dr. Ali Javed, Director, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066. Editor : Dr. Ali Javed, Tel : 26103381, 26103938